لکھنؤ کی شاعری
اُس کا اسلوب اُس کے اصناف اور منتخب کلام
محمد باقر شمس
مقدمہ
ڈاکٹر احسن فاروقی

سلسلہ دارالتصنیف رجسٹرڈ کی گیارھویں کتاب

لکھنؤ کی شاعری

اس کا اسلوب، اس کے اصناف اور منتخب کلام

محمد باقر شمس

مقدمہ

ڈاکٹر احسن فاروقی

مطبوعہ

باب الاسلام پریس

ملنے کا پتہ

دارالتصنیف ۳۰ ۔ سی رضویہ کالونی کراچی ۱۸

ہمارے مطبوعات

ہمارا ادارہ صرف مولانا محمد باقر شمس کی تصنیفیں شائع کرتا ہے اور اس وقت تک جتنی کتابیں شائع ہوئیں سب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔

ناظرین ہماری کتابوں کی فہرست طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر کتاب میں دوسری کتابوں کی فہرست ہونا چاہیے مگر یہاں اسٹاک میں کتابیں ہی نہیں ہوتیں تو فہرست سے فائدہ کیا اس وقت ہمارے پاس صرف دو کتابیں موجود ہیں۔

(۱)
شعور و شاعری

اس میں مشہور شعرا کے کلام کی فنی غلطیاں بتا کے ان کی اصلاح کی گئی ہے

قیمت چھ روپے

(۲)
لکھنؤ کی تہذیب

اس میں لکھنؤ کی تہذیب کی ایک ایک چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو لکھنؤ کی تہذیب کا دلکش مرقع ہے اس پر تبصرہ میں جناب [illegible] نے لکھا ہے کہ میں نے اب تک ایسی کتاب نہیں دیکھی۔ قیمت بارہ روپے۔

ملنے کا پتہ

دارالتصنیف ۳۰ ۔ سی رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸

انتساب

ذوق سلیم کا مظہر شرافت انسانی کا جوہر تہذیب و شائستگی کا پیکر

ادب نواز۔ ادیب ساز۔ انشا پرداز

پروفیسر مسعود حسن ادیب

کے نام

ذرہ ناچیز
شمس

مقدمہ

لکھنؤ کا مدرسۂ شاعری

ڈاکٹر احسن فاروقی
ڈین آف فیکلٹی آف آرٹ بلوچستان یونیورسٹی

جناب شمس کی زیر نظر کتاب اس وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کر رہی ہے لکھنؤ کے مدرسۂ شاعری کو حالی اور شبلی نے یورپ کی رومانی تحریک کے مبہم اثر سے کافی حد تک گرایا بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ دہلی کی شاعری کو صحیح شاعری مانا جانے لگا اور لکھنؤ کی شاعری کو غیر شاعری یا بناوٹی کہا جانے لگا یہ میتھیو آرنلڈ کی تنقید کا اثر تھا جو انیسویں صدی کے آخر تک اہم رہی مگر پہلی عالمی جنگ کے بعد سے ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری اور تنقید کو عروج ہوا اور اس کا خاص نتیجہ یہ نکلا کہ رومانی شاعری کے ذوق کو غیر پختہ ذوق کہا جانے لگا اور خاصی اہمیت کلاسیکی شاعری کو دی گئی جیسے رومانیوں نے انگلستان میں ورڈسورتھ کی شاعری کو اہمیت دی تھی اور پوپ کی شاعری کی بابت یہ رائے دی تھی کہ یہ شاعری ہی نہیں ہے۔ یہ رائے دی دیسے ہی ہمارے یہاں دہلی کے مدرسہ شاعری کو اصل شاعری مانا گیا اور لکھنؤ کی شاعری کو اصول شاعری سے الگ ہٹا ہوا کہا گیا۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے پانسا پلٹ دیا اور پوپ کو سب سے زیادہ نمائندہ شاعر مانا اور تمام رومانی شاعروں کو بالکل رد کر دیا۔ معاملہ اب بھی زیر بحث ہے مگر اس کلیہ سے یہ ضرور سامنے آتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کو بھی رومانی شاعری کے برابر اہمیت دینا چاہیئے ہمارے یہاں دہلی

اور لکھنؤ کے مدرسے سے بالکل الگ الگ نہیں ہوئے کیونکہ دہلی کے مدرسہ کی
خصوصیات لکھنؤ کے اہم شاعر آتش میں اور لکھنؤ کے مدرسہ کی خصوصیات
دہلی کے اہم شاعر ذوق میں نظر آتی ہیں مگر رومانی شاعری کی طرفداری
میں یہ حد پہونچی کہ شبلی کا موازنۂ انیس و دبیر وجود میں آیا جس سے میر انیس
کے ایسے دہلوی اسکول والے شاعروں کو شاعر اور مرزا دبیر ایسے لکھنؤ کے
اسکول والے شاعروں کو غیر شاعر کہنے کی رسم پڑ گئی جناب شمس کی کتاب ایسی
غلط رسم کے خلاف ایک جید اور عالمانہ قدم ہے۔

رومانی اور کلاسیکی شاعری کا اہم فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ اول الذکر
داخلی ہوتی ہے اور آخر الذکر خارجی رنگ کو اہمیت دیتی ہے اس معنی میں
لکھنؤ کی شاعری کلاسیکی ہے اور اس کے سب سے اہم نمائندہ شیخ ناسخ ہیں۔ کلاسیکی
شاعری کی تمام خصوصیات ان کے یہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں پھر ان کے اثر سے
لکھنؤ میں ایک گروہ شاعروں کا پیدا ہوا اور ہوتا رہا انہی بابت شمس صاحب
نے مفصل طور پر لکھا ہے اور ضرورت بھر اہم مثالیں دی ہیں۔ خارجیت کے
ساتھ ان شاعروں میں طرز اور ترنم کی وہ خوبیاں بھی ہیں جن کو انفرادی
طرز کے خلاف سماجی طرز کا لازمی حصہ قرار دیا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے
شاعری محض ذاتی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ ایک معاشرہ کی جذباتی زندگی
کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ زبان اور بیان کے وہ اسالیب سامنے
آتے ہیں جو فرد کی زندگی کے بجائے ایک پورے معاشرہ کی زندگی کے لئے
اہم ہیں۔ یہ شاعری بھی جذباتی اور مبہم نہیں رہ جاتی بلکہ واضح بیانی
اور عروضی اصولوں کی صاف صاف پابندی نظر آتی ہے۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ
اپنی تنقیدوں میں ٹکنیک کا لفظ خاص طور پر استعمال کرتا ہے اور

لکھنؤ کی شاعری خاص طور پر اہم ٹکنیکی جدتوں سے معمور ہے اور ان کی کمال
کے ساتھ وضاحت شمس صاحب نے زیر نظر کتاب میں کر دی ہے۔

ایک نئی بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ لکھنؤ رومانی طرز کا بھی اسکول
ہے جس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بھی اہم ٹکنیکی جدتوں سے معمور
ہے لہذا یہ کہنا کہ لکھنؤ کی شاعری رومانی نہیں غلط ہے اس کو انہوں نے
دلیلوں اور مثالوں سے ثابت کیا ہے۔

یورپ کے ہر ملک میں جدیدیت کی تحریک کا اہم رجحان یہ ہے
کہ وہ رومانی طرز کو چھوڑ کر کلاسیکی طرز کی طرف آتی ہے۔ ہمارے
یہاں جدیدیت کی تحریک تو شروع ہو چکی ہے مگر ہمارے شاعروں کو
یہ نہیں معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی روایت سے تعلق کس طرح
پیدا کریں اور اس لئے جدید شاعری بے بنیاد ہی رہی جا رہی ہے
شمس صاحب کی زیر نظر کتاب کی جدید دور میں سب سے بڑی اہمیت
یہ ہے کہ وہ اس اہم راہ کے نشانات واضح طور پر بتاتی ہے جن پر چل
کر جدید شعراء اپنا مقصد مستحکم طریقہ پر حاصل کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کتاب
عام صاحبان ذوق کے لئے بصیرت افروز ہے اور ذوق ادب کے
اسی توازن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اہم قدم ہے جو حالی اور شبلی نے
اپنی کم علمی کی وجہ سے اور جدت کے غلط جوش میں بگاڑ دیا تھا۔ اس
طرح یہ کتاب دو اہم باتوں میں تمام تنقیدوں سے زیادہ کار آمد ثابت
ہوگی اول یہ کہ اس کے ذریعہ ہماری اردو روایت میں جدید ترین
راہوں کا پتہ لگے گا اور شاعروں کو صحیح راہ پر چلنے کی توفیق ہوگی دوسرے
یہ کہ تمام قاری کے سامنے سے طرفداری کا دھواں چھٹ کر وہ صاف

تضاد دکھائی دیگی جو جدید ترین شاعری کی اہم بنیاد ہوسکتی ہے اور جو متوازن ذوق ادب کی ضمانت ہے۔

اس میں بہت سی نئی باتیں بھی ہیں جو ابتک کسی کے علم میں نہ تھیں مثلاً اہلِ لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ کی ادبی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور ٹکسالی زبان کے معنی وغیرہ۔

مولانا کی یہ بڑی خصوصیت کہ ان کے مطالب اور تخیل ترتیب دلنشیں تحریر شگفتہ زبان مستند اور معیاری ہوتی ہے وہ ایک منفرد مفکر اور صاحب طرز انشاپرداز ہیں علمی و ادبی حیثیت سے ان سے استفادہ کرنے والوں میں اپنا شمار کرکے فخر محسوس کرتا ہوں۔

احسن فاروقی

۳ر جنوری ۱۹۷۸ء

فہرست مضامین

معذرت

یہ کتاب جن حالات میں چھپی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں جگہ جگہ کمی اور نقائص رہ جائیں۔

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی اور نوبت رائے نظر کے اشعار بہت کم ہیں۔ ہمارے کئی دوستوں نے مہیا کرنے کا وعدہ کیا مگر وفا نہ ہوا اس کے علاوہ اغلاط کی تصحیح بھی صحیح معنوں میں نہ ہو سکی بہت باتیں کہنے کے قابل رہ گئیں اور یہ سب مجبوری سے ہوا انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔ فقط

والسلام

محمد باقر شمس

دیباچہ

یہ کتاب مدت سے ناتمام پڑی تھی اور میرے خیال میں چھپنے کے قابل نہ تھی کیونکہ ہر باب ناقص تھا۔ ایک دن مکرمی جناب ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب سے ذکر آیا انھوں نے کتاب دیکھنے کے لیے لے لی دوسرے دن فرمایا کہ لکھنؤ کی شاعری پر بحث مکمل ہے باقی فروعات ہیں جن کے بغیر کتاب ناقص نہیں کہی جا سکتی اس کو چھپ جانا چاہیئے اس میں بہت سی نئی باتیں ہیں جو اب تک نہیں کہی گئیں ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور اس کی اشاعت پر اصرار کیا میں نے کتاب پریس میں بھیج دی جن شعراء کا کلام نہ مل سکا اس کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہو رہی ہے مثلاً سید مرزا انس شاگرد ناسخ، میر علی محمد عارف مرزا کاظم حسین محشر فرزند حسین ذاخر مجاور حسین تمنا اولاد حسین شاعر مہدی حسین ناصری حکیم آشفتہ۔ سراج منظر حکیم ناطق انند نرائن ملا ان سب کا کلام نہ مل سکا اور یہ بہت بڑی کمی ہے۔

ایک ناہمواری اس کتاب میں اور نظر آئے گی کہ شعراء میں کسی کے حالات سرے سے ہیں ہی نہیں کسی کا ذکر دو تین سطروں میں ہے اور کسی کا صفحوں میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارا موضوع لکھنؤ کی شاعری ہے شعرائے لکھنؤ نہیں وہ معروف شعراء جن کا ذکر تذکروں میں تفصیل سے موجود ہے ان کا تعارف مختصر لفظوں میں ہے۔ جن کا حال تذکروں میں مختصر ہے یا بالکل نہیں ہے ان کے حالات جس حد تک معلوم تھے سب لکھ دیئے۔ ناسخ و آتش کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے جس کی اس میں گنجائش نہیں اس کو مستقل طور سے لکھنے کے لیے چھوڑ دیا۔

مرثیہ پر گفتگو بہت طولانی ہو گئی ہر عہد کے مرثیہ گویوں کا ذکر اور ان کے کلام سے مثالیں مستقل کتاب چاہتی ہے اس لیے اس کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھا ہے اسی طرح مثنوی اور دوسری بحث کا ذکر بھی رہ گیا۔ فقط

والسلام

ذرہ ناچیز

محمد باقر شمس

۲۸ر جنوری سنہ ۱۹۷۸ء

مقدمہ

غزل اور اس کا موضوع

ہر صنفِ سخن کی کچھ لفظی و معنوی خصوصیتیں ہیں لکھنؤ کی شاعری میں بھی ہر صنف کی خصوصیتیں الگ الگ ہیں۔

لکھنؤ کی شاعری کی عام خصوصیت لیکن ایک عام بات جو تمام اصنافِ سخن میں مشترک ہے وہ زبان کی شستگی روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی کہیں صنائع و بدائع کہیں سادگی کہیں دونوں کا حسین امتزاج طرزِ ادا میں کہیں جدت مگر ہر صورت میں دل میں اتر جانے والی معنوی وضاحت ؎

جو سمجھ ہی میں نہ آئے وہ کہا جاتا نہیں — جاوید

اب تک جن لوگوں نے لکھنؤ کی شاعری پر لکھا ہے ان میں اکثر نے صرف غزل کو سامنے رکھا ہے۔ شاعری تمام اصناف پر حاوی ہے میں سب پر گفتگو کروں گا مگر غزل کو میں نے مقدم رکھا ہے۔

غزل زندہ صنفِ سخن ہے کیونکہ وہ زندہ ہے اور بہت دنوں تک زندہ رہے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت مختصر اور مختصرات کا مجموعہ ہے اس میں الفاظ کا استعمال اس سلیقہ سے ہوتا ہے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا ہو جاتا ہے اور ہر شعر ایک مکمل داستان بن جاتا ہے کبھی لمبے لمبے فقرے اس طرح حذف ہوتے ہیں کہ وہ سمجھے جاتے ہیں کبھی تاریخی واقعات سیاسی حالات فلسفیانہ مضامین ہمارے تجربے اور مشاہدے کے تحت الشعور میں دبے ہوئے نقوش، تمثیل و کنایہ کے پردہ پر ابھر آتے ہیں اور زمانہ کی گردش دوستوں کی بے وفائی، دنیا کی ناپائیداری

توکل، قناعت اور حیات و کائنات کے بہت سے مسائل نہایت موثر طریقہ سے ادا ہو جاتے ہیں جو ہمارے حالات کا آئینہ ہمارے نفسیات کی محاکات اور ہمارے تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں۔

غزل کی مقبولیت کے اسباب مولانا حالی کے بقول :۔ "محفلِ عشرت کی گرمی اور بزمِ معرفت کا ہنگامہ بھی اسی پر منحصر ہے"۔

بہت سے شعر حکیمانہ قول اور کہاوت کی طرح زبان کا جزو بن گئے ہیں جو اٹھتے بیٹھتے بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں — ناسخ

تمام عمر یونہیں ہو گئی بسر اپنی — شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا — "

صحرا کو کبھی نہ خالی رشکِ وحشت سے پایا — کیا کیا جلا ہے سا کھو بھولا جو ڈھاک میں — "

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے — آتش

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا — "

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا — "

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا — "

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے — "

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے — "

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے — "

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل — رند

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے — گھٹ کے مر جاؤ یہ مرضی مرے صیاد کی ہے — مونس

قسمت کی نارسائی سے ٹوٹی کہاں کمند — وہ چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گئے — شاد لکھنوی

کبھی ایک ہی مصرع یہ کام دے جاتا ہے ؎

اجل سر پہ کھڑی ہے خواب غفلت میں زمانہ ہے — ناسخ
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے۔ — ،،
اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں — ،،
شیر قالین اور ہے شیر نیستاں اور ہے — ،،
ہے اگر وہم تو علاج نہیں — ،،
کہیئے کیسا مزاج عالی ہے — ،،
خدا جانے اب کیا ہوا ہے چاہتا ہے — ،،
نہ جانے خدا کیا کیا چاہتا ہے — ،،
یہ بزم خیر ہے لاخیر کا مقام نہیں — آتش
بس ہو چکی نماز مصلی اٹھائیے — ،،
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے — ،،
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا — ،،
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ — بادشاہ نصیر الدین حیدر
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلہ ہوتا ہے — برق
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں — صبا

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے — نسیم
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر — وزیر
ٹالے نہ ٹلتے ہیں جب تک لگ لگا جاتی — اختر
معلوم ہو گا حشر میں پیمانہ ہے کا — ،،
اور جو کا دیا جلا دیئے جاتے ہیں — رند
بات تب ہی کھولی التجا کر کے۔ — ،،
مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی۔ — عشق و
پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر — مضطر
جب بیٹے رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا — قلق
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے — امیر
ملک الموت نے گھر دیکھ لیا — جاوید
تلوار کاٹتی ہے سپاہی کا نام ہے — ماہر
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی — جلال
دو ہرن زخمی کئے صیاد نے اک تیر سے — رشید
بعد اپنے حسن و عشق کا قصہ تمام ہے — ماہر

غزل کا اصلی موضوع

غزل کی دلکشی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کا اصل موضوع صنف نازک سے مرد کا جنسی میلان ہے اس کی صورت حسن، چال ڈھال، زیور بناؤ سنگار پر مرد کی فریفتگی اس سے ملنے کی آرزو، اس سے وصل کی تمنا اس کی لذتیں۔ ہجر کی اذیتیں۔ یہ عورت سے کسی اور طرح کی محبت سے انکار کرتی ہیں۔

مرد عورت پر اسی وجہ سے فریفتہ ہے کہ وہ اس سے جنسی خواہش پوری کرنے کا مشتاق ہے حسن محض عشق کا سبب نہیں ایک حسینہ کسی کی بیٹی اور بہن بھی ہے مگر اس کا حسن و جمال اس کے باپ اور بھائی کے لئے غزل کا موضوع نہیں اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے درمیان جنسی خواہش کا دخل نہیں مگر وہی حسینہ اپنے محبوب کے لئے قیامت ہے اور غزل میں اس کی ہر چیز اور ہر ادا کے بلائے جان ہونے کی عجیب عجیب تشبیہیں اور استعارے ہیں۔ دنیا کی جتنی چیزیں انسان کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر سکتی ہیں وہ عورت کے کسی وصف ذاتی یا اضافی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

غزل کی تشبیہیں اور استعارے

زلفیں، کمند، افشاں کہکشاں، پیشانی چاند، ابرو کمان، نگاہ تیر، مژگان نشتر آنکھیں جادو فرمہ، رخسار پھول، ہونٹ پنکھڑی، دہن غنچہ، دانت موتی، ٹھڈی سیب، چہرہ چاند، پستان انار، انگلیاں شمع کافوری، پنڈلیاں بلوری، جسم چاندی کا، قد سرو کا، چال چکور کی۔

لباس میں :۔ دوپٹہ، محرم، نقاب، انگیا، کرتی، چولی ان سب کا رنگ، چیتی انگڑائی میں ان کا مسکنا اور عاشق کی طبیعت کا کھسکنا۔

سامان آرائش میں :۔ کنگھی افشاں۔ سرمہ مسی۔ غازہ۔ مہندی۔ آرسی۔ آئینہ سب اس کے دل کو تہ و بالا کرنے کے سامان ہیں۔

زیور میں :۔ بجلیاں۔ بالیاں۔ بندے۔ طوق۔ گلوبند۔ بازوبند۔ تعویذ۔ چوڑیاں۔ پازیب خلخال اور اس کی جھنکار اس کے دل کو تڑپا دیتی ہے۔

اداؤں میں تبسم بجلی گراتا ہے انگڑائی دل کی رگیں توڑ دیتی ہے

شرم وحیا قہر ڈھاتی ہے اس کے علاوہ ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اور ہر شیوہ جان لیوا

وہ پردہ نشین ہے باحیا ہے باعزت ہے چلمن کی آڑ سے کہیں نگاہ پڑ گئی بس دل ہاتھ سے جاتا رہا راز عشق چھپانا اس کو رسوائی سے بچانا اس کا نام زبان پر نہ آنا محبت کا تقاضا ہے۔ بہت بے چینی میں اشاروں کنایوں اور رمز کر ضمیروں میں کچھ دل کی حالت زبان پر آجاتی ہے اس پر دل ودین نثار، اس کے دید کی تمنا، اس سے وصل کی آرزو اس کے ہجر میں آہ وزاری، اس کے انتظار میں بیقراری اس کے نہ آنے پر یہ خیال کہ وہ وعدہ فراموش ہے، ظالم ہے، سنگدل ہے، آہ وزاری کا اس پر اثر نہیں ہوتا یہاں اختر شماری ہے وہاں مانگ میں افشاں بھری جارہی ہے تڑپانے میں اس کو مزہ اور دل جلانے میں لطف آتا ہے، اس کی گلی کا چکر ہے، اس کے ہجر میں وحشت ہے صحرا نوردی ہے گریبان چاک ہے اس کے فراق میں مر مر کے جینا اور راتوں کو آٹھ آٹھ کے رونا ہے بہتا ہوا دریا بھی کبھی تھم جاتا ہے مگر دل ہے کہ کسی وقت نہیں تھمتا باغ بے اس کے ویرانہ اور بہار خزاں ہے محبت زندگی اور اس میں مبتلا رہنا حاصل زندگی ہے، واعظ وناصح کا سمجھانا گراں ہے چارہ گر کی تدبیریں ناگوار ہیں ان پر پھبتی کستا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے ہر شخص رقیب ہے مگر سب بوالہوس خود سچا عاشق ہے اس کو نامہ شوق لکھتا ہے پیام محبت بھیجتا ہے آدمی، کبوتر، بادِ صبا اس کے قاصد ہیں بے خودی طاری کرنے کیلئے شراب ہے ساقی ہے۔

ادھر معشوق شانہ کشی و زلف آرائی میں مشغول نہیں بلکہ حیا مانع ہے، شرم دامن پکڑے ہے گھر والوں کا خیال ہے خاندان کی عزت کا پاس ہے راز عشق کھل جانے میں رسوائی کا ڈر ہے چپکے چپکے آنسو بہانا اور دل مسوس کے رہ جانا اس کی زندگی ہے وہ بھی اس احتیاط سے کہ گھر والے حالت میں کوئی تغیر محسوس نہ کریں۔

یہ مضامین غزل کی جان اور ایشیائی تمدن کے تقدس کا نشان ہیں ان بندشوں سے آزاد ملکوں میں تمدن کی یہ شرافت کہاں۔ گل وبلبل شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں کی محبت کس شاعری کو نصیب ہے۔

ان سب کی ایک زبان ہے ایک لہجہ ہے جو تمام اصناف سخن سے مختلف ہے خاص طور پر حسن وعشق کے نازک جذبات عاشق کی نیاز مندی عاجزی معشوق کی بے نیازی غرور حسن نازو ادا کے لئے لہجہ بہت نرم اور لوچ دار ہوتا ہے جب شاعر ان مضامین کو مناسب زبان اور لہجہ میں ادا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو شعر حسن وعشق کی بولتی ہوئی تصویر بن جاتا ہے ؎

یوں کوئی زلف بناتا ہے سنورنے والے
جو نہ ہوتا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے

ہائے وہ زلف کو بکھرائے کسی کا کہنا
جس کو ہونا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے

غزل پر اعتراض

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ غزل گو کے اعصاب پر عورت سوار ہے گل وبلبل، چاند سورج تارے شراب وکباب ساقی ومیخانہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں وہ نیا مضمون پیدا اور حیات وکائنات کے مسائل بیان کرنے سے قاصر ہے۔

یہ اعتراض اب سے پچاس برس پہلے نہیں کئے گئے۔ مغربی شاعری سے نیم آشنا اور مشرقی شاعری سے ناآشنا یہ باتیں کہتے ہیں۔

عورت ہمیشہ سے مرد کی محبت کا محور رہی ہے دُنیا میں اس سے زیادہ دلکش مرد کے لئے کوئی چیز نہیں حیات و کائنات میں، اس کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں جب تک دُنیا اور یہ نظام فطرت قائم ہے اس وقت تک عورت مرد کی محبت کا مرکز رہے گی۔ اس کو جانے دیجیے کہ نظام فطرت میں اس کو کتنا دخل ہے۔ اس کی تفصیل غزل کا موضوع نہیں غزل کا تعلق اس سے ہے کہ انسان مال دولت عزت آبرو ہوش حواس سب اس کے پیچھے کھو بیٹھتا ہے فطرت اس کی طرف مائل ہے اس سے بے نیازی اسی کے لئے ممکن ہے جس کی فطرت میں بگاڑ ہو (عنّین یا خنثیٰ) انبیاء بھی اس سے دامن نہ بچا سکے۔ یہ بلا ہمیشہ انسان پر مسلط رہی اس کی ہر ادا مرد کے لئے حیات و کائنات کا اہم مسئلہ اور آفاقی کلچر ہے ؎

فتنہ در سر بتاں مست خرام — ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں تیر
چالی جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی
جادو بھرا تھا سرمہ دنبالہ دار میں — ملتے ہی آنکھ دل نہ رہا اختیار میں
راضی ہوں میں وہ جو ستم ناروا کرے — بس میں کسی کے دل نہ کسی کا خدا کرے

ہر قوم کی زبان و شاعری اس کے تمدن کی عکاس ہوتی ہے خاص طور پر غزل جو سوائے اُردو فارسی کے اور کسی زبان میں نہیں اس کی ایک مخصوص فضا ہے ایک خاص آہنگ ہے اس کی تشبیہوں استعاروں کی ایک الگ دُنیا ہے اس کی ایک مخصوص زبان ہے اور اس میں ایک خاص لوچ، لچک اور ہلکا پھلکا پن ہے معترض اس کے لطف سے محروم ہیں اس کی ٹیکنک سے ناواقف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل و دماغ پر جو عریاں شاعری چھائی ہوئی ہے اور جس تمدن کی برتری کے وہ قائل ہیں۔

وہاں ہر وقت اور ہر جگہ عشق آسان اور "دلے افتاد مشکلہا" کا کوئی خطرہ نہیں۔ بازار، سینما، کلب، پارک، اسکول، کالج یہاں تک کہ اپنے گھر پر والدین کے علم میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اس سے پردہ اور پردہ نشین نقاب۔ چلمن۔ رازِ عشق۔ پردہ داری محبت۔ اشتیاقِ دید۔ شرم و حیا ہجر و فراق کے بہت سے مضمون جو ہماری غزل کی جان ہیں ان کے لئے فرضی دور از قیاس اور غیر فطری ہیں ان کے یہاں عورت کی حیثیت غالبؔ کے جامِ سفال سے زیادہ نہیں ؎
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اکبر الٰہ آبادی نے اس معاشرے کی کتنی اچھی اور سچی عکاسی کی ہے ؎
وصل کے بعد تھینک یو کہہ گئے — ان سے رخصت ہوا میں اے اکبرؔ

ایشیا کا معشوق اتنا سہل نہیں اس کا عاشق کے اعصاب پر سوار رہنا یہاں کے تمدن کے موافق ہے اگر کسی کو عورت سے نفرت اور اُردو شاعری سے رغبت ہے تو اور اصناف موجود ہیں۔ ایک صنفِ سخن جس کی ساری دلکشی اسی میں ہے کہ اس کا موضوع عورت ہے اس سے اس کو خارج کرنے اور فرضی غیر فطری پاک محبت داخل کرنے کی خواہش سے زیادہ بدذوقی کیا ہو سکتی ہے۔

یہ شکایت بھی صحیح نہیں کہ گل و بلبل کے علاوہ کچھ نہیں۔ گل و بلبل۔ چاند۔ سورج اور تاروں سے زیادہ حسین شراب سے زیادہ پر کیف تیر نشتر سے زیادہ چبھنے والی کوئی چیز نہیں جب تک دُنیا قائم ہے ان سے زیادہ بہتر چیزیں نہیں مل سکتیں یہ مضامین نہیں نام ہیں اور معشوق کے وصف ذاتی یا اضافی کے استعارے ہیں ان کا

استعمال اسوقت تک ہوتا نہیں ہو سکتا جب تک ان سے بہتر اور موزوں تر چیزیں وجود میں نہ آجائیں اگر یہ چیزیں پرانی ہیں تو محبوب کے چشم و ابرو وغیرہ کی جگہ اور سا جنت بھی تو خلقت آدم سے اسوقت تک نئی ہی

اس صورت میں محبوب کے چہرہ کے لئے چاند سورج پھول تبسم اور انگڑائی کے لئے بجلی نگاہ کے لئے تیر و نشتر سے بہتر استعارہ کیا ہو سکتا ہے ان کی دلکشی کبھی ختم نہیں ہو سکتی انھیں فرسودہ کہنے والا ذوق سلیم سے محروم ہے۔

جس طرح ہر نئی چیز پرانی چیزوں سے ایجاد ہوتی ہے اسی طرح دنیائے شاعری کے ان موجودات سے شاعر نیا مضمون پیدا کرتا ہے۔

معشوق کی انگڑائی بڑی دلکش ہوتی ہے۔ وہ اس حالت میں زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے فرسودہ مضمون ہے عزیز لکھنوی کا شعر ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن   بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا   عزیز

انگڑائی سے حسن کے بڑھ جانے کی یہ تعبیر کہ پر لگ گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اڑا جاتا ہے نئی بات ہے اور اپنے مرکز نے تو قیامت ڈھا دی۔ جسم میں جو حسن کے مرکز ہیں انگڑائی میں حسن ان مرکزوں کی طرف مائل پرواز تھا یعنی ان میں حسن بڑھ رہا تھا اس سے پہلے کس نے یہ بات کہی؟ اسی انگڑائی کو مانی جائسی نے ایک اور طرح کہا ہے ؎

حسن قامت کی جو حد کھینچی تھی رعنائی نے   اس کو دو ہاتھ بڑھایا تری انگڑائی نے

ہم پرانے عاشق ہیں پرانا مضمون ہے عشق نے اسے نیا کر دیا ہے ؎

شعلۂ حسن سے تھا دود دل اپنا اول   آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

اسی کو جاوید نے ایک نئی طرح کہا ہے ؎

آج کے دن کی خبر دل کی دھڑکن نے دی تھی   بچپنے میں کبھی سنتے تھے جو افسانۂ عشق

عزیز مرحوم کہتے ہیں ؎

سوز میں عشق رہی بعد فنا بھی دل میں   حصۂ عمر مرے عشق کو کافی نہ ہوا

دل نہ ہوتا جب بھی تیرا عشق ہی ہوتا روح کو   اس گرہ نے اور اس رشتہ کو محکم کر دیا

کیا یہ نئی باتیں نہیں ان میں جو چیز پرانی ہے وہ مضمون نہیں نام ہیں استعارے ہیں اور وہ کبھی نئے نہیں ہو سکتے۔

ہر بڑا شاعر نئے مضمون پیدا کرتا ہے پپیہے کی پر درد آواز کی ہزاروں توجیہیں کی گئیں ہیں مولانا صفی لکھنوی نے بالکل نئی بات کہی ہے ؎

تو بھی مائل ہے تمنا مرے انداز میں ہے   جب تو یہ درد پپیہے تری آواز میں ہے

عاشق مرنے کے بعد بھی سوز عشق میں مبتلا رہتا ہے بلکہ اس کی خاک کا ذرہ ذرہ اسی طرح کرب و اذیت میں رہتا ہے جس طرح زندگی میں تھا والد مرحوم نے جس اہتمام سے اس مضمون کو باندھا ہے اردو میں اس کی نظیر نہیں ملتی ؎

دل تھام لیا اپنا صحرا میں بگولوں نے   اف کہہ کے جو گرد اٹھی بیٹھی ہوئی تربت کی

غزل کا یہ موضوع، یہ سب تشبیہیں اور استعارے ایران میں پیدا ہوئے اردو میں جب شاعری شروع ہوئی تو اسی کی تقلید کی گئی اس میں اجتہاد یہ ہوا کہ فارسی میں مذکر اور مؤنث کی ضمیریں ایک ہی ہیں مگر اردو عورت کی مردانگی کی متحمل نہیں لیکن غزل میں معشوق کو رسوائی سے بچانے کے لئے مذکر ضمیروں سے ابہام پیدا کیا گیا جرأت کا شعر ہے ؎

قصیدہ اور غزل میں تھا ترا نام گر لانا   ترے پیارے زبان پر نام میرا پھر نہ تو لانا

اس فرق کے علاوہ غزل اب تک وہی ہے جو فارسی میں ہے۔

غزل کی یہی خوبیاں اور دلفریبیاں دنیا میں ہر جگہ سے زیادہ شاعری کو آبرو و وقار میں زندہ کئے ہوئے ہیں اور جب دنیا کے تمام ملکوں میں شاعری ختم ہو جائیگی جب بھی وہاں شعریت قرنوں تک زندہ رہیگی جہاں غزل کہی جاتی ہے اس وجہ سے میں نے بھی غزل کو سب سے مقدم رکھا ہے اور اب جہاں شاعری کی لفظ آئے گی وہاں مراد غزل ہو گی۔

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری پر تبصرہ

لکھنؤ کی شاعری پر جن لوگوں نے بحث کی ہے انھوں نے پہلے دہلی کی شاعری کو پیش کیا ہے کیونکہ لکھنؤ کی شاعری اس سے الگ کوئی چیز نہیں اس سے خودبخود دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا موازنہ ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنا ممکن بھی نہیں۔

اس میں عام طور پر لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں پہلے ان پر گفتگو ضروری ہے۔

مولانا امداد امام اثر نے لکھا ہے کہ

دہلی کی شاعری میں داخلیت اور لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی اور دوسرے نقادوں کی رائے ہے کہ دہلی کی شاعری میں یاس و حسرت اور لکھنؤ کی شاعری میں عیش و عشرت ہے۔ دہلی کی شاعری میں صوفیت اور لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت ہے۔ دہلی کی شاعری میں سادگی لکھنؤ کی شاعری میں تصنع ہے۔

فراق گورکھپوری کی رائے ہے کہ

دہلی کی شاعری میں امارد سے جنسی تجربے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں عورت ہے۔

نیاز فتحپوری کہتے ہیں۔

دہلی کا شاعر خراب الفت ہونے کے بعد ایک دنیا اپنی علیحدہ قائم کر لیتا ہے جہاں وہ کائنات سے بے نیاز ہو کے شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے جذبات کی ایک حزیں راگنی میں گنگنایا کرتا ہے اور لکھنؤ کا شاعر طالع ناساز کی تمام پاس افزینیاں دیکھنے کے بعد بھی کوچہ محبوب کو نہیں چھوڑتا۔

محفل یار میں غیروں سے انکا التفات دیکھ دیکھ کے جل رہا ہے مر رہا ہے لیکن ایک سرکش گدا کی طرح وہاں سے نہیں ٹلتا یہاں تک کہ وہیں دم دیتا ہے۔ ذبح ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی نہیں بلکہ موت کا بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا محبوب بھی با زلف پریشان اس کے جنازے کے ساتھ ہے لکھنؤ میں تاثرات محبت کی یہ فضا پیدا ہو جانا جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے نزع۔ جان کنی۔ واویلا بین۔ شیون۔ جنازے کے مناظر ———— دردناک تو ہے لیکن خودداری اور وقار کی بلندی نہیں رکھتا لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا رُخ وہ ہے جس کا تعلق صرف محفل طرازیوں سے ہے اور جہاں عامۃ الورود جذبات اُلفت سے بحث کی جاتی ہے اس رنگ میں لکھنؤ کا شاعر ہر چند اہلِ نظر کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتا لیکن ایک بوالہوس کی حس پرستیاں بھی ہمیشہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوتیں ————

لکھنوی شاعری کا یہ رُخ ضرور قابل لحاظ ہے اور ایک رند شاہد باز کی زندگی کے بہت سے نکتے اس میں تلاش سے مل جاتے ہیں ————

کی روانی زبان کی پاکیزگی الفاظ کی شائستگی لکھنؤ کی شاعری میں اپنی جگہ خاص چیز ہے اگر کوئی اسے تکمیل کے ساتھ ادا کر سکے

محاورات کی شگفتگی جو اہلِ لکھنؤ کا حصہ تھی"۔ (انتقادیات حصہ دوم ص ۵۰ تا ۵۴)

مولانا امداد امام اثر کی رائے صحیح نہیں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی شاعری میں داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی میر و ناسخ کی ہم طرح غزلیں دیکھئے ؎

میر

وہ ظالم بھی تو سمجھے کہدیا ہے ہم نے یاراں کو
کہ گورستاں میں گاڑیں جدا ہم اہلِ ہجراں کو

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو
نکالا سر سے میرے جائے مو خارِ مغیلاں کو

جلے ہیں کب سے مژگاں آنسوؤں کی گرم جوشی سے
اس آبِ چشم کی جوشش نے آتش دی گلستاں کو

بنے نا واقفِ شادی اگر ہم بزمِ عشرت میں
دہانِ زخمِ دل سمجھے جو دیکھا روئے خنداں کو

نہیں ریگِ رواں مجنوں کے دل کی بیقراری ہے
کیا ہے مضطرب ہر ذرہ رنگِ بیاباں کو

ہوا و ابر سے کچھ بھی نہیں جو تو نہ ہو ساقی
دمِ افسردہ کر دے منجمد رشحاتِ باراں کو

ناسخ

درازی یاد دلواتی ہے اس زلفِ پریشاں کو
عزیز اس واسطے رکھتا ہوں میں شبہائے ہجراں کو

ہزاروں صدمۂ جانکاہ سہیں پر میں نہیں مرتا
کہوں اب آبِ حیواں ظلمتِ شبہائے ہجراں کو

حنا خالق نے پیدا کی جو تیرے پاؤں کی خاطر
بنایا میرے تلووں کیلئے خارِ مغیلاں کو

نہ دیکھا سایۂ جب گلشن میں اس سروِ چراغاں کو
کیا سروِ چراغاں نے سیرِ گلستاں کو

ہم اے جراح برسوں رو چکے ہیں دو دن تو دے
نہ سی پھر خطا ظالم دہاں زخمِ خنداں کو

جنوں نے جھگڑے دی روزِ ازل ترغیبِ عریانی
گریباں صبح کو بخشا دیا دامن بیاباں کو

نہ کیونکر چشمِ مستِ یار خوش ہو میرے رونے سے
کہ ناسخ دوست رکھتا ہے ہر اک میخوار باراں کو

یاس و حسرت عیش و عشرت بھی دونوں جگہ کی شاعری میں موجود ہے۔

لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت کا خیال بھی غلط ہے بلکہ اس کا الٹا ہے دہلی کی شاعری میں سوقیت ہے لکھنؤ کی شاعری مہذب اور سنجیدہ ہے اور یہی اس کا امتیاز ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ دہلی کی شاعری میں ابھار دیئے جنسی تجربے اور صوفیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

امرد پرستی نہ ہونے پر تو کسی کو اعتراض نہیں بلکہ بعض لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے ان میں پنڈت دتاتر یہ کیفی بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ غزل لکھنؤ جا کے فطرت کے موافق بن گئی یعنی امرد کی جگہ عورت اس کا موضوع بن گئی۔ ہاں تصوف کی شکایت ہے۔

غزل اور تصوف | میرے خیال میں غزل کو تصوف سے کوئی ربط نہیں۔ ایسی ذات جو فہم و ادراک سے بلند اندازہ و قیاس سے باہر جاسے محسوس کرنے سے قاصر نہ کوئی چیز نہ کسی چیز کی طرح اس کے عشق میں بیقراری اس کے ہجر میں گریہ و زاری اس سے وصل کے لئے اضطراب کتنی غیر شاعرانہ بات ہے۔ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر نے اس کو بہت عمدہ طریقہ سے کہا ہے ؎

آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں
پردہ نشیں سمائے دلِ ناشناس میں!

نیاز فتحپوری نے سچ کہا ہے کہ عشق اس دنیا میں اسی گوشت و پوست کے پتلے سے ہو سکتا ہے اس کے علاوہ اگر کوئی روحانی عشق ہے تو وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں نہ غزل سے اس کا کوئی تعلق ہے"۔

خود تصوف کے مضامین ایسے خشک اور بے کیف ہیں جو غزل

کا موضوع نہیں بن سکتے۔

ہر شاعر کا کلام اس کے ذوق اور معتقدات کا آئینہ ہوتا ہے صوفی شعراء نے غزل میں اپنے مزعومات اور معتقدات اشاروں اور اصطلاحوں میں بیان کئے ہیں شاعری میں اصطلاحات کی گنجائش نہیں اس کا تعلق عام زبان سے نہیں ہوتا صوفیا اپنی بات کہہ کے دل ہی دل میں مزے لیتے ہوں گے ان کی نقالی اوروں نے بھی کی ہے جیسے ؎ غالب

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
میں ہوں خود دریا وے کو تہ نظر ہے سامنے — ظرف موج و قطرہ میرے رخ اک پردا ہو گیا
پردہ کو تعینوں کے در دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

غیب و شہود غزل میں بے معنی لفظیں ہیں ان اشعار کو وہی سمجھ سکتا ہے جو وحدت وجود حجاب و تعینات وغیرہ مصطلحات صوفیہ سے واقف ہو یہ نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کے مضامین ہیں۔

غزل میں مصطلحات و مفروضات شعراء کے علاوہ کسی معنی بند لفظ کی گنجائش نہیں۔

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں کیف ہے ؎

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — کتنے ہیں بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

نہ کیوں وہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے — نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے

ان اشعار میں جمال دلفروز نگاہ ناز، شرم۔ ادائے ناز۔ آنکھوں آنکھوں میں دل کی بات کہہ دینا ایسی باتیں ہیں جن سے لطف پیدا ہوا ہے۔ یہ جنس لطیف کی دلکش خصوصیتیں ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مجازاً خدا کے لئے بھی یہ سب کہا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے تمام اشعار میں صنعت ایہام یا توجیہہ ہوتی ہے اور اس میں جو دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ تصوف کے عنصر سے نہیں بلکہ ایہام و توجیہہ کے اس پردے سے جس کے پیچھے سے ہمیں صنف نازک کی جھلک نظر آتی ہے۔

اسی طرح توکل صبر و قناعت رضا بالقضا توبہ و انابت بے ثباتی دنیا۔ ترک دنیا وغیرہ کے مضامین میں جب ہی لطف پیدا ہوتا ہے جب وہ غزل کی زبان میں کہے جائیں جیسے میر کا یہ شعر ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — جو چاہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

ایسے اشعار اساتذہ لکھنؤ کے یہاں بھی ہیں ؎

نہ کوئی ان کے سوا اور جہان میں دیکھا — دہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا
کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا — نئے لباس میں دیکھا تجھے جہاں دیکھا

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ ہے جسے اہل لکھنؤ عارفانہ کہتے ہیں اس میں مصنوع سے صانع کی معرفت کا مضمون ہوتا ہے یہ اہل لکھنؤ کا خاص موضوع ہے اور اس میں نہایت عمدہ شعر کہے گئے ہیں ؎

ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں — اک مشت خاک کو مہ انور بنا دیا رشک

لکھنؤ کی شاعری میں سادگی

لکھنؤ کی شاعری میں سادگی نہ ہونے کا خیال بھی درست نہیں ہر بات تصنع اور تکلف ہی سے نہیں کہی جاتی کبھی سامنے کی بات برجستہ اور سادگی سے ادا ہو جاتی ہے ناسخ جو تکلف میں مشہور ہیں ان کی سادگی دیکھیے ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

بہار آتے ہی ہر سمت پھول پھولے ہیں
ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی

صحرا کو بھی نہ پایا رشک و حسد سے خالی
کیا کیا جلا ہے ساکھو لالہ جو ڈھاک بن میں

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی
ساقیا جلد آ ہوا بدلی

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

فراق یار میں فصلِ بہار آئی ہے
الٰہی آتش گل سے تمام باغ جلے

گھر مرا فرقت میں سونا ہو گیا
کنج مرقد کا نمونہ ہو گیا

لکھنؤ کی شاعری میں تصنع

لکھنؤ کی شاعری میں تصنع کی شکایت بھی کی جاتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صنائع و بدائع کا استعمال بہت ہے یہ بات صحیح ہے مگر قابلِ مذمت نہیں اس سے زبان کو بہت فائدہ ہوا ایہام گوئی تو پہلے ہی سے تھی اب صنائع و بدائع سے بے لطف سادگی دور ہو گئی اس کی مثال ماہر القادری کا یہ نعتیہ شعر ہے ؎

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا دنیا ان سے عقبیٰ ان سے
دونوں جگ ہیں ان کی بدولت صلی اللہ علیہ وسلم

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا بات صرف اتنی ہی ہے اسی کو ان الفاظ میں دھرایا ہے دنیا ان سے عقبیٰ ان سے اسی کو دوسرے مصرع میں یوں کہا ہے دونوں جگ ہیں ان کی بدولت شعر حسن معنی اور حسن بیان دونوں سے عاری ہے۔ میں نے اس پھیکے شعر میں یوں لطف پیدا کر دیا ہے ؎

مزرع دنیا گلشن عقبیٰ دونوں شاداب ان کے قدم سے
تابش قدرت بارش رحمت صلی اللہ علیہ وسلم!

ہمارے عزیزوں میں حکیم سید علی صاحب آشفتہ بڑے باکمال شاعر تھے انھوں نے ایک رباعی کہی جس کے آخری دو مصرعے یہ تھے۔

اے مالک کائنات جلوے برسیں
اس بزم کو بزم نور کرنا ہے مجھے

والد مرحوم کو جب یہ رباعی سنائی تو فرمایا تیسرا مصرع یوں بنا دو ؎

اے ابر کرم فلک سے جلوے برسیں

اب مصرع آسمان پر پہنچ گیا یہی صنعتوں کا مقصد اور اہل لکھنؤ کا خاص ذوق ہے وہ اسے محاسن شعر یہ کہتے ہیں مگر آج کل جان بوجھ کے لوگ اس سے بچتے ہیں اگر کوئی صنعت آجاتی ہے تو کہتے ہیں اس میں کیا دھرا ہے ایک صنعت پر شعر کی بنیاد ہے یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی نہ ہوتی تو کون سی خوبی پیدا ہو جاتی اساتذہ دہلی و لکھنؤ نے ہر زمانہ میں صنعتوں سے شعر میں خوبی پیدا کی ہے مومن کا مشہور شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کہتے ہیں ؎

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

ان اشعار میں سارا لطف صنعت سے ہے

اکبر الٰہ آبادی کا کلام اس قدر مقبول ہے ان کے ہر شعر کی بنیاد کسی صنعت پر ہے۔ صنعتوں کے مخالفین ان کے بھونڈے استعمال سے بے مزہ ہو کے صنعتوں ہی کی مخالفت کرتے ہیں بے ڈھنگا استعمال سب کی طبیعت پر بار ہوتا ہے اسی طرح بے لطف سادگی بھی ناگوار ہوتی ہے اس وجہ سے صنعتوں یا

یا سادگی کا سرے سے مخالف ہو جانا صحیح نہیں پرہیز کے قابل وہ بات ہے
جس سے لطف سخن جاتا رہے خواہ بے مزہ سادگی ہو یا صناعی

نیاز صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے اس سے بھی مجھے اختلاف ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کی شاعری کے بارے میں جو کہا ہے وہی سب مومن کی شاعری کے متعلق بھی کہا ہے اگر ابتدا میں جرات و رنگین اور آخر میں داغ کو بھی شریک کر لیا جائے تو تہذیب و سنجیدگی لطف زبان و حسن بیان میں لکھنؤ کی برتری کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور یہی حقیقت ہے۔

مولانا عبد الحلیم شرر نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

اب اکثر شعراء اپنے اشعار میں بازاری عورتوں کی ان اداؤں اور حرکتوں بلکہ اب کپڑوں اور ان اعضاء کا ذکر بار بار کرتے ہیں جس سے شعر مبتذل ہی نہیں فحش ہو جاتا ہے اور ملک میں چونکہ بد تہذیبی اور شہوت پرستی کو ترقی ہو رہی ہے اس لئے ہر طرف سے اس پر صدائے تحسین و مرحبا بلند ہوتی جاتی ہے۔

دہلی والے اس کا الزام زیادہ تر شعرائے لکھنؤ کو دیتے ہیں اور چونکہ یہ اعتراض کسی حد تک صحیح بھی ہے اس لئے کہ لکھنؤ کی شاعری نے ایسے بازاری مذاق کے شاعر واقعی زیادہ پیدا کئے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری دور کا بگڑا ہوا مذاق تھا جس میں لکھنؤ اور دہلی کی کوئی تخصیص نہیں سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کے

بعض شعراء میں اس مذاق کا زور و شور جب تھا اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ داغ کی معرفت اس فخر کو دہلی نے لکھنؤ سے چھین لیا اور جس حد تک داغ کی شاعری عروج پاتی جاتی ہے اسی حد تک یہ مذاق بھی روز بروز ملک میں زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔

رسالہ معیار ۱۳۲۴ھ جلد ۱

مولانا کی رائے صحیح نہیں عورتوں کی اداؤں لباس اور اعضاء کا ذکر میر و سودا کے یہاں بھی ہے اور غزل کا موضوع ہے اس میں ابتذال اور بازاریت زبان طرز ادا اور لہجہ سے پیدا ہوتی ہے اگر اس کو مہذب اور سنجیدہ طریقہ سے کہا جائے تو یہ غزل کی جان ہیں (تفصیلی بحث آگے آئے گی)

اس میں بازاریت کی ابتدا جرات و رنگین سے ہوئی اور داغ تک وہ رنگ باقی رہا اسے لکھنؤ کے سر تھوپنا درست نہیں اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے غلط طور پر کچھ شاعروں کو لکھنوی اور کچھ کو دہلوی قرار دے کے ان کے مخصوص طرز کو دہلی اور لکھنؤ کا طرز قرار دیا ہے یعنی جب وہ دہلی کی شاعری کی خصوصیت بیان کرتے ہیں تو میر و سودا درد اور مصحفی کا کلام پیش کرتے ہیں اور آگے بڑھ کے غالب کو بھی ملا لیتے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں جرات و رنگین اور انشاء کا کلام پیش کرتے ہیں اس طرح وہ میر و سودا اور درد کو دہلوی اور جرات و رنگین و انشاء کو لکھنوی فرض کرتے ہیں۔

میر نے نوّے برس کی عمر پائی آگرے میں پیدا ہوئے ابتدائی زندگی وہیں گزاری جوانی میں دہلی اور بڑھاپے میں لکھنؤ آئے ان کی عمر برابر کے تین حصوں میں منقسم

آگرے میں پیدا ہونا جوانی تک وہیں رہنا ایسی بات ہے جس سے انھیں آگرے کا تسلیم کرنا چاہیے مگر ہم ان کو دہلوی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بحیثیت شاعر کے زیر بحث آتے ہیں اور ذوق شعری ان کا دہلی میں پروان چڑھا اسی وجہ سے وہ اپنے کو دہلوی کہتے اور سب انھیں دہلوی سمجھتے ہیں۔ اسی اصول پر ہم جرأت رنگین۔ انشاء اور مصحفی کو بھی دہلوی سمجھتے ہیں۔

انشاء نے لکھنؤ میں جو ہنگامے کیے وہ سب اس سے پہلے دلی میں کر چکے تھے لکھنؤ آئے اور وہاں کی فضا سے متاثر ہونے کی وجہ سے اگر جرأت و رنگین و انشاء کو لکھنوی کہا جاتا ہے تو یہی وجہ میر و سودا کو بھی لکھنوی سمجھے جانے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

جرأت اور میر میں تو کوئی فرق ہی نہیں دونوں ایک ہی زمانہ میں لکھنؤ آئے اور ایک ہی سال دونوں کا انتقال ہوا اگر جرأت کی شاعری لکھنوی ہے تو میر کی شاعری دہلوی کیوں؟

اور ستم ظریفی دیکھیے میر تیس برس سودا بارہ برس مصحفی بیالیس برس لکھنؤ میں رہے اور لکھنوی نہیں کہے جاتے اور رنگین نو برس لکھنؤ میں رہنے سے لکھنوی ہو گئے۔

اس سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ جب دہلویت کا ذکر آتا ہے تو میر و سودا درد و غالب کا کلام پیش کیا جاتا ہے یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا خاص اسلوب اور انفرادیت ہے اگر یہ دہلویت ہے تو دہلی کے ہر شاعر کا کلام ویسا ہی ہونا چاہیے کیا وجہ ہے کہ میر۔ درد۔ سودا۔ شاہ نصیر۔ ذوق غالب مومن اور داغ سب کا رنگ الگ ہے دہلویت وہی ہو سکتی ہے جو سب میں

مشترک ہو یہ اشتراک اگر کچھ ہے تو بعض الفاظ و محاورات تذکیر و تانیث فارسی ترکیبوں کی افراط اور بھونڈے پن ہیں۔

سب سے پر لطف بات یہ ہے کہ دہلویت کے اظہار میں میر و درد کا بہترین کلام اور لکھنویت کے اظہار میں جس کا کلام پیش کیا جاتا ہے وہ اس کا بدترین کلام ہوتا ہے۔

اگر انشاء کا طریقہ غیر راسخ اور جرأت کی چوما چاٹی لکھنؤ کی فضا کا اثر ہے تو میر و سودا کے یہاں بھی وہی ہونا چاہیے اور ناسخ و آتش کو تو او کھیل کھیلنا چاہیے تھا۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ گرد و پیش کے حالات ہی کا اثر نہیں ہوتا اس کی ذاتی افتاد طبیعت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔

جرأت و رنگین اور انشاء کی بیہودگیاں لکھنؤ کی تہذیب کے بالکل خلاف ہیں اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کا رنگ کسی نے اختیار نہیں کیا بلکہ اس کو مردود قرار دیا۔

سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ آتش کا اسلوب دہلوی کہا جاتا ہے یہ خیال نہیں رہتا کہ آتش کا کلام دہلوی طرز کا تسلیم کر لینے کے بعد دہلی کا وہ مخصوص رنگ کہاں رہ گیا جو لکھنؤ میں نہیں پایا جاتا۔

اصل یہ ہے کہ ولی سے مصحفی تک دہلی کی شاعری کا دور تھا سارے ہندوستان میں اسی کی تقلید کی جاتی تھی۔ ناسخ سے لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی تو ہر جگہ اس کی تقلید کی گئی جو آج تک باقی ہے انھیں دونوں کا فرق لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا فرق ہے جو دونوں جگہ کی تہذیب و تمدن میں نظر آئے گا۔

تمدن کی تعریف تمدن شہری زندگی کو کہتے ہیں جس میں لباس خوراک رہنے سہنے کے طریقے رسم و رواج علوم و فنون سب داخل ہیں اور ان سب باتوں میں دیہاتیوں کی بہ نسبت شہریوں میں زیادہ سلیقہ اور نفاست ہوتی ہے۔ تمدن پر سیاسی حالات کا بڑا اثر ہوتا ہے امن و امان خوشحالی اور

خارغ البالی کا تمدن اور ہوتا ہے قتل و غارت اور افلاس و پریشانی کا اور۔ اس لیے پہلے دونوں جگہ کے سیاسی حالات کا بیان ضروری ہے مگر وہی حالات جن سے تہذیب و تمدن کو سمجھنے میں مدد ملے اور ہم یہی کوشش کریں گے۔

دہلی کا تمدن

اُردو شاعری کی ابتدا | اورنگ زیب کے آخری عہد میں اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے بیٹوں میں تلوار چلی۔ بڑا بیٹا

بہادر شاہ اوّل | محمد معظم کابل کا صوبہ دار تجربہ کار اور ہوشیار آدمی تھا اس نے ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں حکومت پر قبضہ کر کے بہادر شاہ لقب اختیار کیا۔ بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالا مگر پانچ برس کے اندر مر گیا اور اس کے بیٹے بنرد آزما ہوئے۔

جہاندار شاہ | دوسرا بیٹا معزالدین جہاندار شاہ ذوالفقار خاں کی مدد سے ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں تخت پر بیٹھا یہ ایک طوائف لال کنور (شریں لقا آرام جاں) پر فریفتہ تھا وہ بہت پست فطرت تھی ہندوستان کی ملکہ بننے کے بعد بھی اس کی بازاریت نہیں گئی رتھ میں بادشاہ کو بٹھا کے چیزیں خریدنے بازار لے جاتی تھی اس کی دو سہیلیاں ایک سبزی بیچتی تھی دوسری کی تمباکو کی بھٹی تھی وہ ان دونوں سے ملنے بادشاہ کو لے کے جاتی تھی ان کو بڑی بڑی جاگیریں اپنے بھائیوں کو اعلیٰ مناصب اور خطاب دلوائے تھے۔ ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے سواری کے آگے نوبت نقارا بجتا تھا امیروں کی محل سرائیں ضبط کر کے انھیں دیدی گئیں تھیں۔ حقیقت میں بادشاہ خود سفلہ مزاج تھا جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شہر میں ایک ڈھلوان چٹان تھی جس پر بازاری لڑکے پھسل پٹی کھیلا کرتے تھے ادھر سے ان کا بھی گزر رہا۔ نہیں معلوم لال کنور نے فرمائش کی یا خود جی چاہ گیا اکبر اعظم کا یہ جانشین سواری سے اتر آیا اور چٹان کو سر کر دیا

اس وقت اس پیر نابالغ کی عمر چہل سال سے بھی بارہ برس زیادہ تھی، اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ اس کی تخلیہ کی صحبتوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا۔

ذوالفقار خاں ذوالفقار خاں دبنگ آدمی تھا دوسروں کو دست اندازی کی ہمت نہ ہوتی تھی وہ بادشاہ اور لال کنور کے بہت سے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تھا اور حکومت کو سنبھالے ہوئے تھا اس پر بھی چاروں طرف سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔

فرخ سیر بہادر شاہ کا لڑکا عظیم الشان بنگال کا گورنر جہاں دار شاہ کا بڑا بھائی جسے قتل کرکے ذوالفقار خاں نے جہاں دار شاہ کو تخت پر بٹھایا تھا اس کے بیٹے فرخ سیر نے اندر ہی اندر تیاریاں کیں اور بارہہ کے سردار عبداللہ خاں صوبہ دار الٰہ آباد سے مدد چاہی پہلے تو اس نے انکار کیا مگر جب یہ ماں بیٹے اس کا دامن تھام کے روئے اور سیادت کا واسطہ دیا تو سید کا دل پگھل گیا اور حمایت پر آمادہ ہوگیا۔ ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء میں جہاں دار شاہ معہ لال کنور کے گرفتار اور چند روز کی قید کے بعد قتل ہوا۔

فرخ سیر بادشاہ اور عبداللہ خاں وزیر اعظم ہوا دربار ڈوم ڈھاڑیوں سے تو صاف ہوگیا مگر پرانے امرا جوڑ توڑ میں لگ گئے ملک کا انتظام نہ ہوسکا چاروں طرف لوٹ مار اور بد امنی اسی طرح رہی جودھ پور کا راجہ باغی ہوگیا فرخ سیر نے مختلف مقامات پر مہمیں بھیجیں سکھوں کی گوشمالی اور راجہ جودھ پور سے مصالحت ہوئی اس کی لڑکی سے فرخ سیر نے شادی کرلی جاٹوں کو بھی سزا ملی لیکن خزانہ خالی تھا۔ فوج کو تنخواہ نہیں ملتی تھی پایہ تخت میں ہنگامہ برپا تھا۔

عبداللہ خاں امراء عبداللہ خاں کا زور توڑنا چاہتے تھے فرخ سیر

شاہی کمار (گیتی آرا بیگم) پر دیوانہ اور معاملات سلطنت سے بیگانہ تھا۔ اس پر اپنے محسن سیدوں کے قتل کا درپے ہوگیا تین دفعہ قاتلانہ حملہ کرایا ہر دفعہ وہ بچ گئے اور سازش کھل گئی جب سیدوں کے لئے کوئی چارہ نہ رہا تو اسے قید کردیا جس میں اس نے خودکشی کرلی۔ حالات سے باخبر شاعر نے تاریخ کہی

عظمت اللہ ؎ مساوات دو اش انچہ باید کردند ۱۳۰

رفیع الدرجات ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء میں سید برادران نے رفیع الدرجات (ابن رفیع الشان ابن شاہ عالم) کو تخت پر بٹھایا۔ یہ مدقوق تھا جب مرنے کے قریب ہوا تو اس کی خواہش پر اس کے چھوٹے بھائی

شاہجہانِ ثانی رفیع الدولہ کو شاہجہانِ ثانی کا خطاب دے کے تخت نشین کیا اس کو عیاشی کے سوا کسی چیز سے کام نہ تھا چند ماہ میں وہ بھی مرگیا۔

تخت و تاج کے لئے یہ خلفشار دہلی کے واسطے نیا نہ تھا جب ایک بادشاہ مرا تو یہی کچھ ہوا ان ہنگاموں سے بھی دہلی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہاں کی آبادی مضطرب نہیں ہوئی ہاں سفلہ مزاج شاہوں کے تخت پر بیٹھ جانے سے ڈوم ڈھاری بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر حکومت کا ساز بھی بجانے لگے۔ علماء اور اہلِ کمال بے قدر ہوگئے مگر تھی لاکھ لٹے کا پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی دہلی سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی اس وجہ سے اہلِ دہلی کے پاؤں وہاں سے نہیں اکھڑے۔

محمد شاہ سید برادران نے ۱۱۳۲ھ میں شاہزادہ عالی گوہر کو قید سے نکال کے تخت پر بٹھایا اور محمد شاہ لقب اختیار کیا۔ یہ عیاشی اور ناچ رنگ میں اپنے پیش رووں سے کم نہ تھے مگر اقبال ساتھ لائے تھے اتفاق سے سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک ایسا آدمی انھیں مل گیا

جس نے سید برادران کو قتل کر کے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اطمینان سے رنگ رلیاں منانے لگے۔ ساز و آہنگ کا دریا بہنے اور حسن و جمال در و دیوار سے برسنے لگا امرا اپنے اپنے صوبے چھوڑ کے دادِ عیش دینے کے لئے آ گئے۔ صاحب مرقع دہلی جو آصف جاہ کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھانے دہلی آئے تھے ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیروں کے گھر سے لے کے بازاروں کا کونا کونا

دامان باغبان و کفِ گلفروش تھا!

اس زمانہ میں (۱۱۳۳ھ) ولی کا دیوان آیا جو پہلے کی بہ نسبت بہت صاف زبان میں تھا اس نے قبول عام حاصل کیا۔

سلطنت اودھ کا قیام | سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک ۱۱۳۴ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے جہاں انھوں نے اتنی مضبوط حکومت قائم کی جو مغل شاہنشاہی سے بھی قوت و طاقت میں بڑھ گئی۔

دہلی پر پہلا حملہ | مرہٹے، سکھ، جاٹ ہر طرف لوٹ مچائے تھے ۱۱۴۹ھ میں بالاجی بشوا ناتھ راؤ پیشوا کا لڑکا اسّی ہزار فوج سے دہلی پر حملہ آور ہوا کالکا کے میلے کو لوٹ کر شہر میں داخل ہوا اور اپنی تمام خواہشیں بادشاہ سے منظور کرا کے واپس ہوا برہان الملک کو اس کی خبر ہوئی وہ ایک جرار لشکر لے کے آندھی کی طرح آیا دو منزلہ کو سہ منزلہ اور سہ منزلہ کو چومنزلہ کرتا ساٹھ کوس کی مسافت ایک دن میں طے کر کے مرہٹوں کے سر پر پہنچ گیا ان کے حواس جاتے رہے برہان الملک کا ارادہ تھا کہ ان کو قید کر کے مع مال و متاع بادشاہ کی خدمت میں حاضر کریں امرائے دربار نے حسد سے بادشاہ کو بھڑکایا کہ شاہی حکم کے بغیر مرہٹوں پر حملہ کرنا (جبکہ بادشاہ ان سے معاہدہ کر چکے تھے) وقارِ شاہی کے خلاف ہے۔ فوراً واپسی کا حکم بھیجا گیا برہان الملک

نے اس حکم کو مخفی رکھا اور مرہٹوں کی اس شرط پر جان بخشی کی کہ وہ کبھی اودھ کا رُخ نہ کریں گے۔

اس کا اثر بڑا گہرا اور دور رس ہوا جب سارا ہندوستان لوٹ مار کی آگ میں جل رہا تھا اودھ میں مکمل امن تھا۔ دہلی کا اس وقتی خلل کے بعد پھر وہی رنگ ہو گیا ادارنگ، سدارنگ، سب رنگ، سارنگ وغیرہ ناچنے گانے والوں کو خطاب دیئے گئے جس سے محمد شاہ رنگیلے مشہور ہوئے سارنگ دیو نے سارنگی ایجاد کی۔

اہلِ دہلی کا زنانہ پن | یہ رنگینی اس حد پر پہنچ گئی کہ مردوں میں زنانہ پن پیدا ہو گیا۔ آنکھوں میں کاجل۔ دانتوں میں مسی، ہاتھ پاؤں میں مہندی کان میں بالے اور کپڑوں میں گوٹا پچکا ٹانکا جانے لگا۔

انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ سادات بارہہ دہلی والوں کو نامرد و زنانہ کہتے ہیں۔ لباس میں پچکا گوٹا ٹانکنا اور ان کی صحبت میں رہنا عار سمجھتے ہیں۔ جانسٹھ و بڈوئی لکھر ولی وغیرہ میں اپنی جاگیر وں پر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعض امرار کی توجہ سے رسد بھی قائم ہوئی اور زیج محمد شاہی مرتب ہوئی۔ فضلی نے روضۃ الشہدا کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام دہ مجلس رکھا۔

دہلی کی امرد پرستی | اس زمانے میں دہلی میں امرد پرستی کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ ترکوں کا خاص ذوق تھا اس کی تاریخ مولانا شبلی کی زبانی سنئے۔

امرد پرستی کی تاریخ | "ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ عرب مطلقاً امرد پرستی سے ناواقف تھے لیکن جب پہلی صدی میں فتوحات کا سیلاب خراسان

تک آیا اور اہلِ فوج مدت تک وطن اور اہلِ وعیال سے
دور رہے اس کے ساتھ لڑائیوں میں سادہ رو نوجوان گرفتار
ہو کے آئے اور غلام بن کر خلوت وجلوت میں ساتھ رہنے
لگے تو امرد پرستی اور شاہد بازی کا عام مذاق پیدا ہوا۔
——— معتصم باللہ نے عرب کو فوج سے نکال کے ترک
بھر دیئے تھے ——— ہر جگہ فوجی صیغوں میں ترک ہی نظر
آتے تھے۔ یہ نوجوان سپاہی۔ حسین اور خوشرو ہوتے
تھے اس لیئے ان کی چال ڈھال رفتار گفتار بات چیت
ایک ایک ادا طنازی اور شوخی کے لباس میں جلوہ گر
ہوتی تھی چنانچہ اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سپاہی
بچے مکتب عشق کے معلم تھے ——— ایاز کا نام تم نے
محمود کے معشوق ہونے کی حیثیت سے سنا ہوگا ———
ترکوں کی معشوقی نے یہاں تک وسعت حاصل کی کہ ترک
کے معنی معشوق کے ہو گئے ع

جملہ ترکان جہاں ہندوے تو

یہ مذاق اس قدر عام ہوا کہ سلاطین ورؤسا تک
علانیہ امرد پرستی کرتے تھے اور دربار میں ان کے معشوق
نظر فروزی کا کام دیتے تھے شعراء سے ان معشوقوں کی
تعریف و توصیف میں سر در باز اشعار لکھوائے جاتے
تھے اور شعراء ممدوح کی عشق پرستی کا علانیہ ذکر کرتے
تھے ——— جب یہ نوخط میدان میں آئے تو گھر گھر آگ

لگ گئی بڑے مقدس درویش اور ارباب حال مکتبوں
میں بچوں کو گھورنے جاتے تھے ——— اُستاد شاگرد پیر و مرید
ایسے نازک اور قابلِ ادب تعلقات بھی عشق پرستی سے خالی نہیں
ہوتے تھے۔ اس حالت نے ملک اور قوم کی اخلاقی حالت پر جو
اثر کیا اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مٹھی بھر تاتاریوں نے خراسان سے
لے کر بغداد تک خاک اُڑا دی"۔ (شعر العجم ح ۴ ص ۱۹۰ تا ۱۹۵)

اس قتل وغارت کا نتیجہ مولانا نے یہ بیان کیا ہے:۔
تاتاریوں کے ہنگامے نے جو اسی زمانے میں شروع ہوا تمام
اسلامی دنیا کو زیر وزبر کر دیا۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی مشرق
ومغرب تک سناٹا ہو گیا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی
بے قدری اور بے حقیقتی پر ہے یہ سب کو آنکھوں سے نظر
آ گئی ——— اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کثرت سے صوفی شعراء
اس زمانے میں پیدا ہوئے کسی زمانے میں نہیں پیدا ہوئے
صوفیت کی ترقی کا نتیجہ امرد پرستی کی فضا میں جو ہوا اس کی کیفیت مولانا شبلی
نے یہ بیان کی ہے۔
اس زمانے میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا صوفیہ
اور اہلِ نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولین قرار دیتے
تھے اور ارباب ذوق کے لیئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی
سامان نہ تھا۔ شیخ (سعدی) چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا
تھا۔ اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا۔ اس لیئے اس
نے سختی سے اس کی برائیاں کی ہیں۔ ۵

سر از مغز دو ست از درم کن تہی ‏ ‏ ‏ چو خاطر بفرزند مردم نہی
مکن بد بفرزند مردم نگاہ ‏ ‏ ‏ کہ فرزند خویشت بر آید تباہ

صوفیہ کا پردہ اس طرح کھولتے ہیں ؎

گروہے نشینند با خوش پسر ‏ ‏ ‏ کہ ما پاکبازیم و اہلِ نظر

صوفیوں کے اس دعوے کو کہ جمال سے ہم کو صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے اس طرح رد کرتے ہیں ؎

چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد ‏ ‏ ‏ کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد
محقق ہماں بیند اندر ابل ‏ ‏ ‏ کہ در خوبرویانِ چین و چگل

یعنی صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے۔ خوشجمال اور پری جمال کی کیا تخصیص ہے۔ ایک باریک بیں کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں جو چین و چگل کے معشوقوں میں ہیں ـــــ ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ جو ہمہ تن ریاکار ہے ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کر سکتا۔ شیخ (سعدی) اس راز سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اس نے نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے ؎

برون نمی روہ از خانقہ یکے ہشیار ‏ ‏ ‏ کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند
محتسب در قفائے رندانست ‏ ‏ ‏ غافل از صوفیانِ شاہد باز

اس طرح تصوف کے ساتھ امرد پرستی پھیلتی رہی یہاں تک کہ

حکومت قائم ہوئی انھوں نے شعراء کو مدحِ اہلِ بیت میں قصیدے اور مصائب میں مرثیے کہنے کی ہدایت کی علماء نے حدیث و تفسیر میں کتابیں لکھیں علوم اہلِ بیت کی اشاعت ہوئی۔ پیری مریدی کا خاتمہ ہوا۔ خانقاہیں ویران صوفیہ منتشر اور امرد پرستی ختم ہوئی۔ مگر مغبچہ۔ ترساچہ۔ ترک بچہ۔ سبزہ خط وغیرہ مضامین یادگار چھوڑ گئی۔

ترکی ذوق ترکستان میں یہ ذوق ترقی کرتا رہا۔ ہندوستان میں انھیں ترکوں کے ساتھ آیا علاء الدین خلجی اور ملک کافور قطب الدین مبارک شاہ اور نو مسلم لڑکے خسرو گجراتی کا عشق تاریخ میں موجود ہے۔ بابر نے تزک میں اپنے استاد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ امرد پرست تھا۔ سمرقند کے بارے میں لکھتا ہے کہ سر بازار امارد کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے لوگ گھومتے تھے کوئی بغیر امرد کے نظر نہیں آتا تھا۔

اپنی پہلی بیوی سے ناچاقی کا سبب یہ لکھا ہے کہ میں اس زمانہ میں ایک لڑکے بابری پہ دیوانہ تھا۔ جہانگیر نے تزک میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں سرمد اور ابھے رام کا عشق مشہور ہوا۔ جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کے ایک لڑکے کو بھی اس کا شکار بتایا ہے اور بہادر شاہ کے زمانہ میں اس کی عمومیت پہ ایک گاف مردانامہ لکھا ہے۔ (میں نے گاف لکھا ہے انھوں نے صاف لکھا ہے) یہ گاف مردانامہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

پان کھا کر گاف مردا کھیلئے ‏ ‏ ‏ باغ جا کر گاف مردا کھیلئے
بادشاہی ہے بہادر شاہ کی ‏ ‏ ‏ بن بنا کر گاف مردا کھیلئے
وقت آں آمد کہ در ہر بھیڑ بھاڑ ‏ ‏ ‏ گھس گھسا کر گاف مردا کھیلئے
عطر مل کے جو ترٹوں کے بیچ میں ‏ ‏ ‏ مل ملا کر گاف مردا کھائیے

عطر ملتا بتاتا ہے کہ طبقہ امراء میں یہ ذوق پھیل گیا تھا۔

دہلی کے مشہور امرد پرست | محمد شاہ کے زمانے میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ جس طرح دوسرے شہروں میں امراء رنڈی بازی میں شہرت رکھتے تھے اسی طرح دہلی کے امراء امرد پرستی میں مشہور تھے خان اعظم کے متعلق صاحب مرقع دہلی لکھتے ہیں۔

"بمقتضائے رنگینی مزاج اور بہار راگ ہندوستان کے مطربوں میں ممدوح ہیں۔ ان کی طبیعت امارد پسند ہے سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار ہیں اپنی جاگیروں کی ساری آمدنی ان پر صرف کرتے ہیں۔ جہاں کسی امرد رنگین کی خبر پاتے ہیں اس کی حسب خواہ رعایت کر کے رفاقت کی کمند میں پھانس لاتے ہیں۔ اس گروہ کی ایک جماعت ان کی حسن سعی سے مناسب مناصب پر فائز ہو کر ان کی انیس بساط ہے اور ایک جماعت مراعات خانگی پر اکتفا کر کے محفل نشاط کو رنگین بنائے ہوئے ہے سواری کے ساتھ بڑی شان و شکوہ سے گھوڑوں پر سوار ہو کے چلتے ہیں۔ غرض جہاں کوئی سبزہ رنگ نظر آتا ہے خان اعظم سے منسوب ہے اور ہر نو خط اس عظیم الشان سے وابستہ ہے۔" ص۲۷

ایک دوسرے رئیس مرزا منو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مرزا منو جو امیر زادہائے زمانہ میں ہیں اس فن کی جادوکاری میں یگانہ ہیں۔ امیر زادے اس فن کی گھاتیں ان سے سیکھتے ہیں اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں وہ اس محفل کے صدر ہیں ان کی بزم غلماں صورت کے منتظم ہیں ان کا گھر شداد کی بہشت اور پریزادوں کا آشیانہ ہے جو نو خط رنگین اس محفل سے ربط نہیں رکھتا وہ فرد باطل ہے اور جو رنگین اس مجمع میں شریک نہیں بے اعتبار ہے ان کی محفل شاہدوں کا دار العیار ہے۔" ص۲۷

میرن صاحب کا حال سنئے :۔

"میرن صاحب وزیر الممالک کے یہاں معزز و محترم ہیں تلاش مردم حسین میں طرفہ مہارت رکھتے ہیں۔ ہر روز ایک نیا لڑکا پھانس لاتے ہیں۔" ص۳۴

دہلی میں امارد کے اڈے | رنڈیوں کے اڈوں کی طرح دہلی میں لڑکوں کے اڈے تھے قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں :۔

شام کے وقت حسین و خوبرو اور ملیح لڑکے ان (تاباں) کے مکان پر جمع ہوتے تھے ان کو زیورات سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا تھا اس کے بعد امرائے قزلباش کے طلب کرنے پر محافوں میں بٹھا کے اعلام کرانے کے لئے مہمان جاتے تھے الخ

دہلی کے مشہور امرد | دوسرے شہروں کی رنڈیوں کی طرح دہلی کے امارد مشہور تھے۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے :۔

اللہ بندے سبزہ آغاز متناسب الاعضا لوگوں کا منظور نظر اور مقصود خاطر ہے۔ رجب امرد سیہ فام ہے :۔

ہنگامہ پیراسیان ہنگا کسی کے یہاں نہیں جاتا۔ اس کا شیفتہ خود اس کے گھر جاتا ہے سلطانہ سبزہ رنگ دس بارہ سال کا سن ایک عالم کو مفتون اور ایک

خلقت کو مجنون بنائے ہوئے ہے۔ سرِ بن و رو پ کے
ماتھے کی چمک نظروں کو خیرہ کر تی ہے۔ بڑی مشکل
سے ہاتھ آتا ہے (مرقع دہلی ص۳۸)

حد یہ ہے کہ علماء و فقہاء اور صوفیا بھی اس میں مبتلا تھے۔ مرزا
مظہر جانجاناں کے متعلق صاحب تذکرۂ علماء ہند لکھتے ہیں۔

"دانشمند متبحر جامع فضائل صوری و معنوی بود اکتساب
علوم از علمائے وقت نمودہ و حدیث از حاجی محمد افضل
سیالکوٹیؒ اخذ کردہ و شرف ارادت و خلافت از حضرت
سید محمد نور بدایونی مرید و خلیفہ شیخ سیف الدین مرید
. . . . مرید و خلیفہ شیخ محمد معصوم قدس سرہٗ الوثقیٰ
مرید و خلیفہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی یافتہ ص۲۲۷

یہ فضائل صوری و معنوی سے آراستہ اور خصائل قبیحہ سے پیراستہ بزرگ
امرد پرست تھے۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم میں لکھا ہے:۔

"حسن پرستی سے دلبستگی تمام رکھتے تھے اور عشقِ حقیقی و
مجازی سے کام انعام اللہ خاں صاحب یقین اور محمد تقیہ
درد مند ان کے شاگرد ان رشید سے کہلاتے ہیں اور
میر عبدالحئی تاباں علیٰ ہذا القیاس اسی طرح گنے جاتے ہیں ص۲۱۴۔"

انعام اللہ خاں یقین کے حالات میں بھی اس کا ذکر ہے۔
منظورِ نظر مرزائے مذکور ص۳۶

محمد تقیہ درد مند کے حالات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔
"نظر کردہ مرزا مظہر جانجاناں"

عبدالحئی تاباں کے ذکر میں بھی ان کے اس تعلق کا ذکر ہے۔
"ان کا عشق مظہر کے دل میں گھر کر گیا تھا"

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں مرزا صاحب کے متعلق لکھا ہے۔
"میر عبدالحئی تاباں کی محبت میں زار و نزار تھا۔

شیفتہ نے مرزا صاحب کے اس ذوق کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔
"برعنا جوانان نظرش بود۔

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں عبدالحئی تاباں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے:۔

"تاباں تخلص میر عبدالحئی نام۔ شاہجہاں آبادی نہایت
عزیز و خوبصورت اور صاحب جمال تھا۔ دلی سے شہر میں بے مثال
تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان
سے دین و دل نثار کرتے تھے اور پرے کے پرے عاشق جانباز
کے یاد میں اس لب جاں بخش مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلّف
یہ ہے کہ اس رعنائی اور دلربائی پر خود بدولت بھی دل
کھو بیٹھے تھے ______ اس لیلیٰ صفتی پر مانند مجنوں ہمیشہ
سرگرم فریاد و آہ رہتے تھے یعنی سلیمان نامی ایک لڑکے
کو چاہتے تھے اور اس کی محبت میں باوجود وصل کے آٹھ
پہر کراہتے تھے"۔

مرزا سودا کو بھی ان کے عاشقوں کی فہرست میں لکھا ہے۔
"بلکہ مرزا رفیع سودا بنا بر یک نظر توجہ اکثر اشعار کو ان سے صلاح لیا کرتے تھے۔ ص۱۰۹"

میر احمد یار بھی اسی طرح کے معشوقوں میں تھے۔ تذکرہ میر حسن میں ان کے
متعلق یہ لکھا ہے:۔

"جو اُبو د باکمال وجاہت کہ یوسف ثانی تواں گفت و ران زماں عالم عالم فریفتہ رخ نیکو و شیفتہ زلف از بود در وقت احمد شاہ ہنگامہ حسن او گرم بود ایں ہمہ شعرائے متاخریں مانند پروانہ دل خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند او نیز با اینہا صحبت می داشت ـــــ میر ضیا سلمہ نظر الفت داشتند چنانچہ تا حال بہ وقت کہ یاد او می کنند می گریند۔

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ان کا ذکر انھیں اوصاف کے ساتھ ہے

"احمد یار جوانے نہایت زیبا شاگرد میر تقی میرؔ و محبوب میر ضیا در زمان احمد شاہ جمیع شعرائے تعلق بوے داشتہ اند۔"

میر حسنؔ کے تذکرے میں ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر ہے۔

"جعفر علی خاں ذکی :۔ "بہ سوائی رام راجہ بود بہ و تعشق داشت۔"

محمد افضل افضل "بہ کدام ہندو بچہ گوپال نامی بود کہ عاشق شد"

نور اللہ :۔ "بہ یک فرنگی بچہ تعشق بہم رسانیدہ"

میر رضا علی رضا :۔ بہ شخصے وہب علی عاشق است

محمد عظیم عظیم :۔ بہ سادہ عذاراں شیدا"

میر سنیکا :۔ بہ شخصے تعشق و داشت۔

صلاح الدین پاکباز :۔ "بہ سوہنا شخص کہ قوال بچہ بود نظر الفتے می داشت"

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ایسے بہت سے پاکبازوں کا ذکر موجود ہے۔

مہتاب رائے رتسوا :۔ "بہ منون (جوہری بچہ) نامی عاشق شدہ"

محمد چاند رخشاں :۔ بہ زعفران نامی عاشق شدہ"۔

مصحفی نے اپنے تذکرے میں فدوی کے متعلق لکھا ہے :۔

"قدم در راہ امرد پرستی گزاشتہ چند جا خانۂ خنگی ہم کردہ بجو دکان حسین تعشق درزیدہ"

"میر تقی میرؔ نے ذکر میرؔ میں ابدالی کے حملہ سے دہلی کی تباہی پر تاسف کے ساتھ اس پر بھی افسوس کیا ہے کہ بازاروں میں وہ حسین لڑکے اب دکھائی نہیں دیتے اس کے معنی یہ ہیں کہ دہلی میں اس طرح کے لڑکے بازاروں میں عام طور پر گھوما کرتے تھے۔ چوک سعد اللہ خاں اس کا بڑا اڈہ تھا۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے کہ :۔

رقص امارد و خوش شرو سے قیامت آباد ہے اطراف و اکناف نو خط لڑکوں سے بھرے پڑے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ لڑکے جہاں آباد کے شہر کہتے ہیں ناز ہو جاتے ہیں تغزل میں اشارہ کیا جاتا ہے

میرؔ کو طفلان تہ بازار[1] میں
دیکھو شاید وہیں وہ گلفروش

گر ٹھہرے فلک آ گئے انھوں کے تو عجب ہے
پھرتے ہیں پڑے دلی کے لونڈے جو بری سے

لڑکے دلی کے ترے ہاتھ میں کب آئے میرؔ
پیچھے اک ایک کے سو سو کی لگے ڈاگ پھرے

میر غفر غلیظی کی وہ مشہور گفتگو جس میں انھوں نے شعراء پر تنقید کی ہے اس میں انشاؔ کو یہی طعنہ دیا ہے۔

"آگے تیغا زاد (یہ بی زاد) تھے ہم بھی گھوغنے (گھورنے) جاتے تھے اب شائق (شاعر) بن گئے ہیں (دریائے لطافت)

---

[1] تہ بازار ۔ بازار میں تجارت کے لیے بیٹھنے والے۔ اسی سے تہ بازاری ہے یعنی وہ محصول جو تہ بازاروں سے وصول کیا جائے۔

اخلاقی پستی کی حد یہ ہے کہ اشعار کو طعنہ تو دے رہے ہیں لیکن اپنی دلبستگی کا کس بلند آواز سے اظہار ہے۔ اور طرہ یہ کہ اس کے ناقل خود یہ اشعار کہتے ہیں۔

ملاّ دوپیازہ | احمد شاہ کے دور میں ملاّ عبدالمومن دہلوی جو ملاّ دوپیازہ کے نام سے مشہور ہیں جیّد عالم تھے اور بہت ظریف الطبع تھے انھوں نے ایک فرہنگ لکھ کے اس وقت کی سیاسی اقتصادی تمدنی اور معاشرتی حالات کی تاریخ مرتب کر دی ہے چند لفظیں ملاحظہ کیجئے :۔

البادشاہ	کاہل زبان	الوزیر ۔	ہذ تیر آہ بیچارہ کا
النواب ۔	مجموعہ تغافل	الامیرزادہ ۔	کون دہندہ بدوس
الغلام ۔	شتاق طعام	الامرد ۔	رہنمائے شہوت
التیز دو ۔	نوکر ماہیانہ تا شخص	البیوقوف ۔	کردسی و دیانت دار

الامیرزادہ کے جو معنی لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں دہلی کے امیرزادوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کی تائید میر تقی میر کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

مست مل اہل دول کے لڑکوں سے میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

مولانا شبلی نے سچ کہا ہے کہ "جب کوئی عیب سوسائٹی میں عام ہو جاتا ہے تو وہ عیب نہیں رہتا" اس زمانے میں امرد پرستی اتنی عام ہو گئی تھی کہ اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شعراء بڑی بیباکی سے اس کا اظہار کرتے تھے۔ ؎

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا ؎ جہاں جاویں وہاں ایک آدھ کو ہم تاک رکھتے ہیں

ہر ایک سبزہ ہے ہندوستاں کا معشوق بجا ہے نام جو عالم رکھا ہے کھیروں کا

جو لونڈا اتام سن امرد پرستی کا چڑھے — میں اس کو بیچ دے باتوں میں جاتا ہوں جو لگ

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بہلا — چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے — کام عشاق کا تمام کیا

دل لیکے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے — اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا چھوڑے — میر

کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ — دل لیتے ہیں یوں کہ ہرگز نہیں ہوتی آہٹ

کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر — اطفال شہر لائے ہیں آفت جہان کے ،،

کیا میر تو روتا ہے پامالی دل ہی پر — ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھا لی ہے ،،

شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے — ظلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر ،،

تھے زمانے میں جن کے خرچ روپے — ٹھانسا کرتے تھے ان کو آنوں پر ،،

فراق گورکھپوری نے سچ کہا ہے :۔

"دہلی میں عشق کو صرف تنہائی ملتی ہے اور زیادہ تر امرد پرستانہ جذبات کے تجربے"۔ رسالہ نگار ریاض ۶۳

بےحیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک رنڈی آدھی بیگم پیجامہ نہیں پہنتی تھی نچلے حصہ پر نقش و نگار بنا کے برہنگی کی کراہٹ کم کرتی تھی اس کو قبول عام حاصل تھا اور ہر محفل میں اس کی جگہ تھی۔ اس فضا میں کوئی بات سنجیدہ اور مہذب کس طرح رہ سکتی تھی۔ اس دور کا کلام اس وقت کے معیار تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔

ان لوگوں نے اپنے آخری زمانے میں اصلاح زبان کی طرف توجہ کی بہت سی ناگوار لفظیں ۔ ستی ۔ سیتی ۔ سین ترک کر دیں الفاظ کی صحت ضروری قرار دی جیسے تسبی سے تسبیح صحی سے صحیح اس پر بھی بقول مصنف شعراء الہند ۔ "ان کی زبان مبتذل اور رکیک الفاظ کا مجموعہ ہے"۔

دہلی پر دوسرا حملہ دہلی میں اس چنگ و آہنگ کے دور (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوا محمد شاہ نے دو لاکھ فوج سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ تین دن تک دلی میں قتل عام رہا ستر کروڑ کا سامان اور تخت طاؤس لے کے واپس ہوا شہر اس طرح برباد ہوا کہ مدتوں آباد ہونے کی امید نہ رہی ٹیک چند بہار جس نے اپنی آنکھوں سے دہلی کو لٹتے دیکھا تھا بیان کرتا ہے۔

"دریں ایام کہ در نہایت کیفیت و لطافت ہر کوچہ چوں لعل
بنفشہ مویان دل آویز و ہر محلہ ش برنگ نفس بلبلاں شور انگیز
سور گردیدہ از بوقلمونی ہائے تقدیر ایں گونہ چشم زخمے رسیدہ
اگر مانند زلف بتاں عمر طویلے می باید کہ دارالعشق بحالت اصلی در آید"

اسی ہنگامے میں اودھ کے صوبیدار برہان الملک نے دہلی میں انتقال کیا اور ان کے داماد مرزا مقیم صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ ملا۔

دہلی پر تیسرا حملہ اس حملہ سے دہلی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی ہر طرف بدامنی اور غارتگری کا دور دورہ تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں حملہ کیا مرزا مقیم صفدر جنگ شہزادہ احمد کو لے کے مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ سرہند کے مقام پر معرکہ کارزار گرم ہوا سترہ دن کی سخت جنگ کے بعد ابدالی کو شکست دی۔ شہزادہ احمد کامیاب واپس ہوا پانی پت کرنال میں محمد شاہ کے مرنے کی خبر ملی صفدر جنگ نے بانس کی کھپچیوں کا تاج بنا کے موتیوں کی جھالر لگائی اور شہزادہ احمد کے سر پہ رکھ کر ان کی شاہی کا اعلان کیا احمد شاہ نے ان کو وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا اور دہلی روانہ ہوئے۔

غازی الدین خاں اب امراء اور صفدر جنگ میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کی نظریں بھی ان سے پھر گئیں اور وہ

اپنے صوبہ پہ واپس چلے آئے۔ غازی الدین خاں نے میدان صاف کے بادشاہ پہ قابو حاصل کرنے کی کوشش کی انھوں نے بہت صفدر جنگ کو بلوایا مگر وہ بیماری کی وجہ سے نہ جا سکے۔ غازی الدین خاں نے ناکارے اور بے دست و پا بادشاہ کو قید کر کے آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔

عالمگیر ثانی ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی کو تخت پہ بٹھا کے سیاہ و سفید مالک بن گیا اسی سال صفدر جنگ کا انتقال ہوا اور شجاع الدولہ جانشین ہوئے۔

غازی الدین خاں بادشاہ کو لے کے پنجاب گیا اور ابدالی کے صوبیدار موسیٰ خاں کی ناکتخدا بہن سے نکاح کیا اور اس کی ماں سے زبردستی تیس لاکھ روپے وصول کر کے پنجاب کی صوبیداری ادینہ بیگ کو دے کے واپس ہوا۔

دہلی پر چوتھا حملہ ابدالی کو خبر ہوئی تو وہ ہندوستان آیا اور دہلی کو دو مہینے تک لوٹتا رہا اس طرح کہ:-

"شہر را آتش نمودہ خانہا سوختند ــــــ بقتل و غارت پرداختند دروازہا شکستند
اکثرے را سوختند و سر بریدند عالمے را بخون و خاک کشیدند
تا سہ شبانہ روز دست ستم بر نہ داشتند از خوردنی و
پوشیدنی ہیچ نگذاشتند سقفہا شگافتند دیوارہا شکستند
جگرہا سوختند وحشت سیرتاں بدر و بام اکابران بے سیرتی
تمام شیخان شہر را بحال خراب بزرگان محتاج دم آب
گوشہ نشینان بے جا شدند اعیان ہمہ گدا شدند وضیع و شریف
عریاں گدا خدایان بے خانماں اکثر بہ بلا گرفتار رسوائے کوچہ و
بازار ۔ ۔ ۔ ۔ ہفت ہشت روز ایں ہنگامہ گرم بود من کہ
فقیر بودم فقیر تر شدم عالم از بے اسبابی و تہیدستی ابتر شد (ذکر میر)

ابدالی نے محمد شاہ کی بیٹی سے شادی کی غازی الدین خاں کو وزارت
سے معزول کرکے روہیلہ سردار نجیب اللہ خاں کو وزیر اعظم بنا کے واپس
ہوا اس کے جاتے ہی غازی الدین خاں نے مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر چڑھائی
کی نجیب الدولہ بھاگ کے اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ شاہزادہ عالی گوہر بنگال
کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے مرہٹوں کی خوشامد سے اپنی شاہی برقرار
رکھی اب پھر غازی الدین نے مرہٹوں کو لے کے پنجاب کو لوٹا اور وہاں مرہٹوں
کا قبضہ ہوگیا اس طرح ہندوستان کے اکثر صوبے مرہٹوں کے قبضے میں آگئے۔

دہلی پر پانچواں حملہ | روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں نے ساری روداد
احمد شاہ کو لکھی اور اسے ہندوستان کی حکومت سنبھالنے کی دعوت
دی اس نے حملہ کیا غازی الدین خاں سمجھا کہ عالمگیر ثانی نے مرہٹوں کے
خلاف ابدالی کو بلایا ہے اس نے بادشاہ کو قتل کرکے لاش جنگل میں پھنکوا دی
خود روپوش ہوگیا۔ اور ابدالی سے پانی پت کے میدان میں وہ تاریخی مقابلہ
ہوا جس میں مرہٹوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا بے شمار مرہٹے مارے گئے۔
ابدالی دہلی کا تخت خالی چھوڑ کے واپس ہوا اب دہلی سکھوں، مرہٹوں،
روہیلوں۔ جاٹوں اور پنڈاریوں کی لوٹ مار کا مرکز بن گئی یہ لوگ
سمجھتے تھے کہ دلی والوں کے گھر دولت سے بھرے ہیں ان پر اتنی سختیاں
کیں کہ آسمان کانپ گیا۔ مرہٹوں نے دیوان عام کی سونے کی چھت اکھاڑ لی۔

شاہ عالم | بادشاہ کے قتل کی خبر سن کے اس کے بیٹے عالی گوہر نے ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء
میں اپنی شاہی کا اعلان اور شاہ عالم لقب اختیار کیا ہے۔ اس وقت
وہ بہار کے ایک موضع کھٹولی میں خیمہ زن تھا۔

بکسر کی جنگ | انگریزوں کا اقتدار بنگال میں قائم ہو چکا تھا بہار میں

پٹنہ تک ان کا قبضہ تھا۔ میر قاسم کو وہ بنگال سے نکال چکے تھے
وہ شجاع الدولہ کے پاس مدد مانگنے آئے تھے۔

شاہ عالم نے پٹنہ سے انگریزوں کو نکال کے اس پر قبضہ کر لیا مگر
انگریزی فوجوں نے آکے ان کو شکست دے دی۔ شجاع الدولہ میر قاسم
کو لے کے شاہ عالم کے پاس پہنچے اور بکسر کے مقام پر ۱۱۷۸ھ ۱۷۶۴ء میں معرکہ
ہوا جس میں شکست کھائی۔ شاہ عالم انگریزوں کے کیمپ میں چلے
گئے اور ان سے معاہدہ کرکے بنگال و بہار اڑیسہ کی دیوانی اور
بنارس و غازی پور تک، ایک تہائی حکومت کی سند ان کو دے دی
اور خود الہ آباد میں آکے مقیم ہوگئے۔

شجاع الدولہ مرہٹوں کو لے کے پھر انگریزوں کے مقابلہ پر آئے
جس میں صلح ہوئی انگریزوں نے ان کا ملک چھوڑ دیا اور انھوں نے
فیض آباد میں قیام کرکے اپنے کو ایسا مضبوط کیا کہ جو امن و امان اور
خوشحالی یہاں تھی وہ ہندوستان میں کہیں نہ تھی۔

دہلی سے پنجاب تک مرہٹے چھا گئے اور لوٹ مار مچائے تھے۔ ہر طرف
سے لوگ فیض آباد کی طرف بھاگے چلے آرہے تھے اور شجاع الدولہ
انھیں آباد کرنے میں فخر اور مسرت محسوس کر رہے تھے۔

نجف خاں | ۱۷۷۱ء میں نجف خاں ایک ایرانی امیر بادشاہ کا وزیر اعظم
ہوا۔ اس نے حالات کی درستی کی بہت کوشش کی بادشاہ کو دہلی لایا
اہل دہلی جو اس وقت تک بے بادشاہ کے ہر قوم کی لوٹ مار کا نشانہ
بنے ہوئے تھے ان کی جان میں جان آگئی۔

نجف خاں نے جاٹوں سکھوں اور روہیلوں کو زیر کیا اور مرہٹوں

اور انگریزوں سے تعلقات بڑھائے شہر میں امن قائم ہوا لیکن (سنہ ۱۱۹۶ھ) وہ ایکایک مر گیا۔

پیشوا اور سندھیا اب پیشوا وزیر اعظم اور سندھیا نائب وزیر بنا بادشاہ کے خرچ کے لیے پینسٹھ ہزار ماہوار مقرر کر دیا وہ مرہٹوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔

دہلی پر چھٹا حملہ روہیلوں کو مرہٹوں کا یہ اقتدار کب گوارا ہو سکتا تھا غلام قادر خاں نے دہلی پر حملہ کیا شاہی فوج مرہٹوں سے ناراض تھی وہ روہیلوں کے ساتھ ہو گئی اور قلعہ پر قبضہ ہو گیا غلام قادر نے چاہا کہ متھرا پر فوج کشی کر کے مرہٹوں کی طاقت کا خاتمہ کر دے سیتل داس خزانچی نے خزانہ خالی بتایا غلام قادر نے شاہ عالم پر سختی کی کہ روپیہ قبولیں مگر وہاں روپیہ کہاں تھا پہلے اس نے قید کیا پھر لاتوں گھونسوں سے مارا جب کسی طرح نہ قبولے تو سینے پر چڑھ کے آنکھیں نکال لیں بیگموں کو طمانچے مار مار کے لہولہان کر دیا۔ شہزادوں اور امیروں کو الٹا کر کے ٹنگوا دیا اور پشتوں کی گڑی ہوئی دولت قبلوا کے تہ خانے اور چھتیں کھدوا کے نکال لی۔

دہلی پر ساتواں حملہ شاہ عالم نے انگریزوں مرہٹوں اور آصف الدولہ کو امداد کے لیے لکھا آصف الدولہ نے ایک فوج اور کچھ رقم بھیجی ادھر سے سندھیا فوج لے کے آیا غلام قادر خاں بھاگ گیا مگر گرفتار ہوا پہلے اس کو گدھے پر سوار کر کے ایک ایک کوڑی بھیک منگوائی اس کے بعد زبان کٹوائی پھر آنکھیں نکالیں پھر ناک کان کٹوائے آخر میں ہاتھ پاؤں کٹوا کے ٹوکرا بادشاہ کے پاس بھیج دیا مگر وہ راستے ہی میں مر گیا لاش دہلی پہنچی جو گھورے پر پھنکوا دی گئی۔

ان ہنگاموں میں دہلی بار بار لٹتی رہی اور اہل دہلی پر وہاں کی زمین تنگ ہو گئی پوتڑوں کے رئیس روٹیوں کو محتاج ہو گئے انشا کا بیان ہے کہ دہلی

ہیں کم تر لوگوں کو نان شبینہ میسر ہوتی ہے۔ مثل مشہور تھی۔

شاہ عالم ثانی نہ چولھے پہ توا نہ گھڑے میں پانی

ادھر لکھنؤ میں چین برس رہا تھا اہل کمال سر اور آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ ہر طرح کے صاحبان فن وہاں چلے آئے اور دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا

اس دور میں میر۔ سودا۔ سوز۔ درد اور اثر ایسے اساتذہ پیدا ہوئے ان کا کلام اس وقت کے حالات کی تصویر ان کی پریشانی خوف و ہراس اور مردہ دلی کی تفسیر ہے ؎

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے — ان کو اس روزگار میں دیکھا — میر
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — 〃
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا — درد
وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا — یعنی کبھو تو اپنے بھی دل دماغ تھا — 〃
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے — 〃
جہاں کو فتنے سے خالی کبھی نہیں پایا — ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا — 〃

عاشقانہ مضامین بھی نہایت گھٹیا درجے کے مفلس عاشق و معشوق کی تصویریں ہیں۔

یار آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی — آزماتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی — سوز
جو کرتا ہوں فریاد میں اس کے آگے — تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے — تاباں
ابھی پست ہو جائے گا لاتوں کے مارے — ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے — 〃

ابتذال کی حد ملاحظہ کیجیے ؎

سرسبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا — آخر خزاں کے آئے کچھ نہ اکھڑا بہار کا — سوز
دعا دی تو کہنے لگا دور ہو! — سنی میں نے دعا تیری دعا کی — 〃

کہا میں نے کہ کچھ خاطر میں ہوگا　　تمہارے ساتھ جو میں نے وفا کی "سوز"
تو کہتا ہے کہ بس بس چوپچ کر بند　　وفا لایا ہے دت تیری وفا کی "

سندھیا سندھیا نے بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لئے نو لاکھ سالانہ شاہی مصارف کے لئے معین کر دیے اور فی الجملہ دہلی میں امن قائم ہوا۔

بادشاہ نابینا انتظام سلطنت کے قابل کبھی نہ تھے ہاں شاعر تھے اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے لکھنؤ کے بعض امرا رسیاسی وجوہ سے دہلی چلے گئے تھے اور شعر و سخن کی محفل جاتے ہوئے تھے ان میں شجاع الدولہ کے بیٹے امین الدولہ ناصر جنگ عرف مرزا مینڈو کے مشاعروں کی بڑی دھوم تھی۔ بڑا اہتمام ہوتا تھا ختم مشاعرہ پر دعوت عام ہوتی تھی ان مشاعروں میں بڑی رسہ کشی ہوتی تھی ایک طرف انشاء اللہ خاں انشا برکت اللہ مشتاق تھے دوسری طرف حکیم قدرت اللہ قاسم حکیم ثناء اللہ فراق مرزا عظیم اکثر تلواریں کھینچ جاتی تھیں اور نواب بیچ میں پڑ کر صلح کراتے تھے۔ بادشاہ سلامت بھی اپنی غزل بھیجتے تھے ان کے درباری شاعر انشاء جرأت رنگین تھے جن کی شاعری خوب چمکی ان کے یہاں حزن و یاس نامرادی اور ناکامی نہیں کیونکہ دہلی کے حالات بدل چکے تھے چھچھورے اور بازاری قسم کے مضامین نظم کئے جاتے تھے۔

ادا جان لیتی ہے جانی تمہاری　　غضب ڈھا رہی ہے جوانی تمہاری "
یار آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا　　چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا "
اس طرح سے کیا کیجئے ملاقات کہیں اور　　دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور "
دیکھے بوسہ مجھے چتون ہی بتاتا ہے یہ شوخ　　ایسا پایا ہے بھلا تو نے مزہ اور کہیں "

یاد آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ　　بیٹھیے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائے گا "
یاد جب آتا ہے رکھنا تو اڑ جاتی ہے نیند　　اپنی ہٹ تو رکھ چکے لو اب تو ہٹ کر سوئیے "
تک چلا میں جو شب وصل تو ہٹ کر بولے　　چھا گیا روزن در نہ ہو ہے ہے کوئی "
دو تین دن تو ہو چکے اب پھر چلو وہیں　　فیروز شہ کی لاٹ کے اس طرح سے کھنڈر پہ چل "

امرد پرستی کے مضامین جو ہر دور میں رہے ہیں وہ ان بیہودہ گوئیوں کے علاوہ ہیں ۱۲۰۳ھ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد یہ شعرا بھی لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

دہلی پر آٹھواں حملہ چودہ برس تک شاہ عالم اسی عالم میں رہے ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں لارڈ لیک فوج لے کے آیا اور مرہٹوں کو نکال کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار بادشاہ کا وظیفہ مقرر کر دیا اب "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" رہ گئی۔ شہر میں مکمل امن قائم ہوا چہل پہل پیدا ہوئی۔ مگر شعراء سب لکھنؤ چلے آئے دہلی میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں رہ گیا۔

لکھنؤ میں سعادت علی خاں حکمراں تھے میر تقی میر۔ مصحفی۔ انشاء جرأت رنگین زندہ تھے آتش فیض آباد میں تھے اور کمسن تھے۔

دہلی میں ذوق تیرہ برس کے، غالب پانچ برس کے اور مومن تین سال کے تھے۔

لکھنؤ میں ناسخ کا ڈنکا بج رہا تھا مولانا عبدالقادر رامپوری اس زمانے میں لکھنؤ آئے تھے وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں۔

"شیخ امام بخش ناسخ کو ان دنوں اس میں دن دونی شہرت حاصل تھی ص ۱۶۰"

انھوں نے زبان و شاعری میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جس سے اس میں سنجیدگی اور حسن پیدا ہو گیا اور سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔

مصحفی ایسے کہنہ مشق استاد نے ان کی تقلید کی۔ غالب کا بیان ہے
کہ میری شاعری کی ابتدا رہتی جب ناسخ کا دیوان دلی پہنچا جس طرح
دلی کے دیوان کی دھوم مچ گئی تھی اسی طرح لوگ ناسخ کے کلام پر
ٹوٹ پڑے۔ میں نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا (جلوۂ خضر)
ناسخ کے اتباع سے ذوق۔ غالب اور مومن کے کلام میں شائستگی
پیدا ہوئی مگر کچھ بھونڈا پن باقی رہا جس کا خود غالب نے اعتراف
کیا کہ "میرے کلام میں جو محاورے غیر فصیح ہیں وہ دہلی کی زبان کا اثر ہیں۔"
شاعری میں بھی ایسی باتیں باقی رہ گئیں جنھیں ذوق سلیم برداشت
نہیں کر سکتا مومن کا یہ شعر زبان اور مفہوم دونوں کے لیے ڈھنگے پن
کی اچھی مثال ہے ؎

سن کے میری مرگ بولے مرگیا اچھا ہوا — کیا برا لگتا تھا جس دم سامنے آجاتے تھا

معشوق کو رقیب نے سیم بر کہا تو اس نے پستان کھول کے دکھا دیے اس پر عاشق
صادق نے اس کی قباحت سمجھائی۔

غیر کو سینہ کھلے سے سیمبر کہلوا دیا — تم نے کیا کچھ کس کو اپنی بات پر کہلوایا

عاشق کی بے غیرتی اور پست فطرتی کی حد دیکھیے ؎

ہے شب وصل غیر بھی کاٹی — اب مجھے آزمائیے گا کب تک

ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اگاتا ہے مجھے — غالب

بدمذاقی کا شاہکار ہے ؎

پروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

لطف زبان اور حسن معنی کا نادر نمونہ ہے

گر نفس جادہ سر منزل تقوی نہ ہوا

اس میں تقوی راضی کا قافیہ اور بدذوقی کی ایسی مثال ہے جس کا جواب اردو شاعری
میں نہیں ہے۔

دلی پر لواں حملہ

دلی میں بہادر شاہ ظفر لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر کا دور تھا اور
ناسخ و آتش کے شاگردوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لکھنؤ میں انتزاع سلطنت ہوا اس
کے بعد ہندوستان میں غدر ہوا رہی سہی دلی بھی لٹی ہزاروں بے گناہ جس طرح مارے
گئے اس کا ایک دن کا نظارہ لارڈ رابرٹس بیان کرتا ہے۔

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو
شہر حقیقت میں مردوں کا شہر نظر آتا تھا کوئی آواز سوائے
ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سنائی نہ دیتی تھی کوئی زندہ آدمی
نظر نہ آیا ہر طرف مردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا جن میں بعض حالت
نزع اور جانکنی میں مبتلا تھے ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ
آہستہ بات کرتے تھے کہ ہماری آواز سے مردے چونک پڑیں۔
اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مردوں کی لاشوں کو کتے کھا رہے
ہیں۔ دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جو ان کے گوشت
کو نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے
کچھ اڑ کر تھوڑے فاصلے پہ جا بیٹھے ہیں ہم کو بڑی عبرت ہوئی
اور ہمارا دل رنجور ہوتا جاتا تھا بعض مردے ایسے پڑے
تھے کہ گویا زندہ ہیں بعض مردوں کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے
تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرف اشارہ کر رہے
ہیں غرض ان مردوں کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی جیسے ہم کو
انکو دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر

بدکتے اور ہنہناتے تھے مُردوں کی لاشیں پڑی تڑپتی تھیں ان
کے تنفس سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو اٹھ رہی تھی۔"

ایک اور انگریز لکھتا ہے۔

"دہلی کے باشندے اگرچہ سب نہیں مگر آدھے باشندے بے تصور
شہر کے گرد و نواح دیہات اور جنگلوں میں پڑے ہوئے بلک
رہے ہیں۔ بحوالہ ۱۹۵۷ء مرتبہ میاں محمد شفیع ص ۲۱۷ تا ۲۱۸

ہندوستانیوں کا خون اس طرح بہانے کے بعد جب انگریزوں کا کلیجہ
ٹھنڈا ہوا تو شہر کی آرائش کی طرف متوجہ ہوئے محلہ کے محلے اور بازار کے بازار
ڈھانے لگے اس سے بچے کھچے لوگوں کا ٹھکانا بھی نہیں رہا۔ مرزا غالب نے اپنے
خطوط میں دہلی کی اس تباہی کا نقشہ جا بجا کھینچا ہے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہاں شہر ڈھے رہا ہے بڑے بڑے بازار خاص بازار،
اردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ
تھا اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں
بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا۔ برسات بھر مینہ برسا اب
تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔"

"مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو دلی کی تباہی پر تم کو رحم
نہیں آتا بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں۔
صحاف اور نقاش کہاں ہیں؟"

ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو دہلی کی تباہی کی داستان یوں لکھی ہے۔

"صاحب! کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ
دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔

اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں
جس میں تم نے تحصیل علم کیا، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ
کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے وہ دلی نہیں ہے جس میں
اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا
حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور
جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اناث
میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جو جوانیں ہیں کسبیاں ہیں امرائے
اسلام میں اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔
سو روپے روز کا پنشن دار۔ سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر
نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ۔ نانا اور نانی
کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان۔ بخشی محمد علی خاں
کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا بیمار پڑا نہ دوا، نہ غذا، انجام کار
مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی احبا کو پوچھو
ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس
ایک پیسہ نہیں ٹکے کی آمدنی نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔
مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڈھے صاحب ساری
املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے
گئے، ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایہ کی املاک واگزاشت
ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔
دیکھیے کیا ہوتا ہے قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور
بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔

شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔

ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے علماء اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے ان کو بھی سچ جانو اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر۔ آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ یکشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء

عافیت کا طالب غالب

رئیس احمد جعفری نے بہادر شاہ اور ان کا عہد ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، اس میں غدر کے بعد کے حالات یہ لکھے ہیں:۔

دہلی غدر کے بعد | صدہا عورتوں نے بدکاری کا پیشہ اختیار کر لیا راتوں کو برقعہ اوڑھ کر مسافروں کی سراؤں کے گرد قطاروں کی قطاریں مسافروں کے بلانے کے انتظار میں بیٹھی یا کھڑی رہتی ہیں اور اس طرح دو چار پیسے صبح کو کما لاتی ہیں بہت سی عورتوں نے اپنا سر منڈوا ڈالا اگر کوئی شخص کبھی ایک خمیری روٹی یا ایک مٹھی چنے کوڑیاں تقسیم کرتا تو صدہا مسلمان عورتیں جمع ہو جاتیں جن میں سے بعض صورتوں سے نجیب زادیاں معلوم ہوتیں جو خود بھی صدہا روپیوں کی خیرات کرتی تھیں اب کوڑیاں مانگتی ہیں۔ جن کے آگے دو دو چار چار مامائیں کام کرتی تھیں اب خود ماماگیری کے قابل نہ رہیں بعض بڑی عورتیں جن کی حسانیت پر فرنگیوں کو بھی رشک آتا تھا۔ اپنی خوش نصیبی سے بعض انگریزوں کے گھر بیٹھ گئیں دہلی میں پہلے بہت کم خانگیوں کے گھر تھے اشراف کبھی اپنے محلوں میں آباد نہیں ہونے دیتے یا پھر جب شہر آباد ہوا ہے تو ہر محلہ میں ایسے دو چار گھر ضرور تھے۔

منشی ذکاء اللہ کی زبانی | بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی احمدی بیگم کی داستان سنئے۔ احمدی بیگم کے شوہر مرزا منجھو جو غدر میں کام آئے بڑے دبدبے کے آدمی تھے ان کی سرکار بنی ہوئی تھی۔ بیسیوں آدمی ان کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے دروازے پر نالکی پالکی موجود تھی۔ جب مرزا مارے گئے اور شہر کی حالت بگڑی تو بڑی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑنے .... کا ارادہ کیا پیڈیوں میں زیور بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کا مال تھا شہر کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی عین شب برات کے روز یہ سب شہزادیاں کھڑی ہوئیں احمدی بیگم کی ضعیفی میرا بچپن تھا انھوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ آخری دنوں میں وہ باہر نکلنے کے قابل نہ رہیں اور بہت تکلیفیں اٹھا کر یہ شہزادی دنیا سے اس طرح رخصت ہوئی کہ کفن تک میسر نہ ہوا ــــ فالج نے بالکل بے کار کر دیا تھا چل پھر نہ سکتی تھیں اور کئی دموں کا گزارہ اس ایک دم کی محنت پر تھا۔ میری (منشی ذکاء اللہ) بارہ تیرہ برس کی عمر ہوگی کہ میری والدہ مرحومہ نے احمدی بیگم کا پتہ دے کر مجھے ایک روپیہ دیا کہ دے آؤ ــــ میں گیا۔ شہزادی کے گھر میں مٹی کے لوٹے برتن تھے اور سردی کے موسم میں بادشاہ کی اولاد بچی

اور سکڑی بیٹھی تھی۔ احمدی بیگم اس روپے کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئیں اور جو دعائیں ان کے منہ سے نکلیں اس کا اظہار مشکل ہے۔ اس وقت تھکتا ہوا گیا اور ہنستا ہوا آیا۔ مگر آج جب اس جھلنگا چارپائی کا خیال آتا ہے تو تڑپ جاتا ہوں۔

شہزادیاں کسبیاں بن گئیں وہ شہزادیاں جو جاہ و جلال کی زندگی بسر کر رہی تھیں طوائف اور کسبیاں بن گئیں۔

شہزادی نکاح باورچی سے متواتر فاقے رنگ دکھاتے ہیں کہ ربیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے ——— منشی ذکاء اللہ اس شادی کا ذکر طنز و تعریض کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

بہادر شاہ کی بیٹی ربیعہ نے اپنا نکاح حسینی باورچی سے اس لئے پڑھایا کہ روز تر دیگی[۵] کھانے میں آئے گی۔ فاطمہ سلطان جس کے باپ کے سر پہ تاج شاہی رکھا جاتا تھا مشنریوں کے زنانہ اسکول میں وظیفہ دار بن کے معلمی کا پیشہ سیکھا ص ۹۸۴ تا ۹۸۶

میں نے دہلی کی تباہی کی داستان ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کی ہے کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دہلی کی صرف رونق اور دولت ہی نہیں لٹی بلکہ اخلاق بھی تباہ ہو گیا۔ ان حالات میں تہذیب و تمدن اور سیرت و کردار زبان اور خیالات میں بلندی کہاں سے آتی۔

---

[۵] تردیگی غلط ہے تر دیگی ہونا چاہیئے۔

لکھنؤ کے تمدن کا پس منظر

یہ بتایا جا چکا ہے کہ شاعری تمدن کا آئینہ ہے اور تمدن نام ہے طرز زندگی میں نفاست و شائستگی کا جس کی انسانی فطرت دلدادہ ہے وہ ہر نفیس اور شائستہ بات کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔

ایران کا تمدن معاشرت کی اسی نفاست سے ایران کی تہذیب ساری دنیا پر فائق ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس نے اس سے کچھ نہ سیکھا ہو عربوں نے ایران کو فتح کیا مگر اس کی تہذیب کے آگے سر جھکا دیا۔

ہندوستان میں جن مسلمانوں نے حکومت کی وہ افغانستان و ترکستان کے مغل اور پٹھان تھے ایرانی کوئی نہ تھا مگر شان و شوکت رعب و داب تہذیب و شائستگی نفاست و پاکیزگی میں ایران کی نقل کرتے تھے یہاں تک کہ درباری آئین اور سرکاری زبان فارسی تھی فارسی ادب ان کا قومی ادب تھا فارسی شاعری ان کی شاعری تھی گلستان بوستان شاہنامہ سکندر نامہ یوسف زلیخا ان کی درسی کتابیں تھیں فارسی خط ان کا خط تھا ایرانی کھانے ان کے دسترخوان کی لذت تھے اور مغلوں کے زمانہ میں تو ایرانی ہی طبیب و شاعر منجم و فلاسفر فاتح ملک مدبر سلطنت حکومت کی شان اور ملک کا استحکام تھے جو عالم طبیب شاعر سپاہی خطاط ایران سے آیا ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اعلیٰ عہدہ و منصب پر فائز ہو گیا۔ ایران ولایت اور ایرانی ولایتی کہا جاتا تھا جس میں عظمت و برتری کا مفہوم مضمر تھا۔

ہمارا سفر ایران ۱۹۵۴ء میں عراق کے راستہ سے میں ایران گیا بغداد سے ایک ایرانی ہمارے ہم سفر ہوئے اتفاق سے ہم اور وہ بس میں ایک سیٹ پر

بیٹھے کھڑکی کی طرف وہ تھے۔ جب وہ کسی ضرورت سے جاتے تو پہلے اپنے جوتے اُتار کے ہاتھ میں لیتے پھر میرے زانوں کو نانگھتے اسی طرح آتے وقت وہ زحمت اُٹھاتے میں نے کہا بھی کہ اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے مگر انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ جب میں نے ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ آقائے علی نقی فلسفی کے بھائی ہیں اور میرے متعلق انہیں ایک پاکستانی مسافر ہونے کا علم تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کے ساتھ ان کا یہ مہذب برتاؤ انسانیت کا احترام تھا۔

خانقین | ہمارا سفر جاری رہا غروب آفتاب کے وقت ہم عراق کی سرحدی چوکی خانقین پہنچے وہاں آمد و رفت کو دخول و خروج سُنا وہاں سے تین چار کوس پر

موردخسروی | ایران کی سرحدی چوکی موردخسروی میں صدور و خروج سننے میں آیا اور ایرانیوں کی پاکیزگی ذوق کا اندازہ ہوا صدور و ورود بھی عربی لفظیں ہیں اور دخول خروج میں ذم کا پہلو بھی عربوں کے محل استعمال کے موافق ہے مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوا۔

گل زمین ایران | اب ایران میں ہمارا سفر شروع ہوا رات ہو چکی تھی اس وجہ سے موردخسروی سے صبح تک کی مسافت کا علم نہیں صبح کو جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ نہروں آبشاروں درختوں پھولوں اور سبزے کی فراوانی تھی چوراہوں پر ایک دائرہ میں سبزہ درخت پھول اور حوض نظر آیا۔

اہل ایران کی نفاست پسندی | حوض پر ایک تختی پر لکھا تھا "نظافت را مراعات دارید" اور ہم نے کسی کو حوض پر منہ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے نہیں دیکھا پانی الگ لے جاکے منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ اس سے جہاں ملک نہروں آبشاروں درختوں اور پھولوں سے بہشت نظر آیا وہاں اس کے باشندوں کی طبعی نفاست کا اندازہ بھی ہوا کہ انھوں نے طہارت کو کافی نہیں سمجھا نفاست کو

ضروری سمجھا جس کی فطرت میں نفاست ہوتی ہے اس کے اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے زبان و خیالات میں بھی نفاست ہوتی ہے اور کسی چیز میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جیسے کہیں بھونڈا پن کہیں ابتذال کہیں چھچھورا پن کہیں بے سلیقگی کہیں بازاریت کہتے ہیں ایرانیوں کی ہر بات نفاست میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے تمدن کو ساری دنیا سے ممتاز کیا ہے اس میں فطرت نے بھی ان کا ساتھ دیا ہے۔

ہر گھر میں قدرتی نہر کی ایک پتلی سی شاخ گزرتی ہے جس سے ہر وقت سرد و شیریں صاف اور تازہ پانی ملتا ہے۔

گھر پھولوں سے بھرے ہیں دیواروں پر بیلیں چڑھی ہیں، خانہ باغ، پائیں باغ انہیں کی زبان کی لفظیں ہیں جو ان کے تمدن کا آئینہ ہیں راستے اور گلیاں پھولوں اور درختوں سے گلزار ہیں رنگ اور پھول ان پر برس رہا ہے قالین پر بیل بوٹے دروازوں پر پھول پتیاں اینٹوں پر گل بوٹے مکان کی جالیوں میں پھول، زمین پر گل کاری (ٹائل) در و دیوار پر نقش و نگار صنادید عجم کی یادگار ہے ان کی زبان میں رنگینی ہے ان کی شاعری میں رنگ اور پھول سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آنکھ نرگس، چہرہ گلاب، جسم یاسمین، دہن غنچہ، لب برگ گل، ہنسی خندۂ گل، قد سرو، زلف سنبل ہے۔ یہ استعارے ایران سے تمام دنیا میں پھیلے۔

مہندی گلاب اور نرگس ایران کی خاص چیزیں ہیں۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔

"ہندوستان کے قدیم ہندو لٹریچر میں عورت کے سولہ سنگھار میں مہندی نہیں یہ ہندوستان کی چیز نہیں ہے مسلمانوں کے ساتھ آئی ہے۔

فارسی شاعری میں اس سے جتنے مضمون پیدا کیے گئے ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں نرگس اور گلاب وہاں کا خاص پھول ہے نرگس کو کہیں اور کی آب و ہوا راس نہیں آئی اس لیے اس نے ایران سے باہر قدم نہیں نکالا گلاب ہر جگہ پہنچا مگر ایران میں اس کا جس جس طرح استعمال ہوا کہیں نہ ہو سکا وہاں اسے گل کہتے ہیں یہ تمام پھولوں کا سرتاج ہے اس کا رنگ آنکھوں میں کھپ جاتا ہے اس کی خوشبو شامہ کو معطر دل میں سرور آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ بلبل مست ہو کے چہکنے لگتی ہے اور اس کے قریب بیٹھ کے اس کی مستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رات رات بھر بولتی ہے۔

گلے کے ہار میں اس کا پیوند ہار کو بھاری بھرکم بنا دیتا ہے گلدان میں دوسرے پھولوں کے ساتھ رعایا میں بادشاہ معلوم ہوتا ہے شاعری میں تشبیہ و استعارہ ہے اس کا عرق کھانوں کو معطر کرتا ہے محفلوں کو بساتا ہے مریضوں کی دوا ہے زبان میں اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے سیکڑوں مرکبات ہیں تنہا گل کے کئی معنی ہیں۔ گلابی کے کئی مفہوم ہیں ہر اچھی چیز اس سے تعبیر کی جاتی ہے اچھی صورت گل رو گل رخسار گل عذار گل چہرہ خوبصورت جسم گل اندام گلبدن اچھا لباس گل پیرہن اچھی بات گل فشانی گل پاشی گل ریزی اچھی آواز گلبانگ۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے سابقے لاحقے اتنے زیادہ ہوں۔

لاحقے | گلاب، گل آفتاب، گلابی، گل بو، گل بازی، گل برگ، گل بن، گل بیگانہ، گلبانگ، گل پاپوش، گل پاش، گل پوش، گل پیادہ، گل تر، گل تراش، گل تسبیح، گل چیں، گلچہرہ، گل زرد، گلدم، گل دام، گلدار، گل دوز، گل رعنا، گل رنگ، گل زمین، گلزار، گلستان، گل شمع، گل شکر، گلشن، گل صبح، گلفام، گلفشاں، گلکار، گل کدہ، گلگوں، گلگونہ، گل میخ، گل مہتاب، گلنار، گل وش، گلِ حشم۔ گلِ کفش۔ گلِ خودرو۔ گلِ رستہ۔ گلِ نو رستہ۔ گلدان۔ گلِ شب افروز۔

سابقے | برگِ گل، تبسمِ گل، خندۂ گل، عرقِ گل، غنچہ گل، دامنِ گل، زرِ گل، بوئے گل، نکہتِ گل، شمیمِ گل، فصلِ موسمِ گل، سبدِ گل، قبائے گل، جامۂ گل، رنگِ گل، روغنِ گل، ساغرِ گل۔

محاورے | گل گفتن، گل دیگر شگفت، گل گشت، گل در آب کردن، گل دادن، گل گل شگفت، گلِ خوردن۔

اب معلوم ہوا کہ وہ دنیا کو گلشن ایجاد کیوں کہتے ہیں۔

رنگ اور ایران | یہی عالم رنگ کا ہے ہر اچھی چیز رنگین ہے، رنگین نوا، رنگین سخن، رنگین زبان، رنگین بیان، رنگین شعر، رنگین ادا، بہت سے محاورے ہیں۔ رنگ بر روے آوردن، رنگ ریختن، رنگ زدن، رنگ بستن، رنگ شکستن، رنگ بر آب ریختن، رنگ گرفتن، رنگ گذاشتن، رنگ نہادن، رنگ ماندن، رنگ چیدن، رنگ مالیدن، رنگ پوشیدن، رنگ خندیدن، رنگ برخاستن، رنگ گسیختن، رنگ گرداند، رنگ جستن، رنگ، رنگ بردن وغیرہ غرض رنگ و بو کا ایک سیلاب ہے اور دنیائے رنگ و بو اسی سے تعبیر ہے اس طوفان رنگ و بو کے پلنے والے اپنی شاعرانہ طبیعت سے روزانہ نئی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

خراسان میں ایک لڑکا دو گلدان ہاتھ میں لیے بیچ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ہم گل و ہم گلدستہ، گلدستہ کے لئے ہم نے یہ فقرہ نہیں سنا تھا۔

اہل ایران کی ایجادیں | دنیا میں ہزاروں چیزوں کے وہ موجد ہیں اور اس دور ترقی میں بھی ان کی بہت سی ایجادوں پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا جام شراب تخت و تاج دربار اور اس کے آئین ساری دنیا نے ایران سے سیکھے کافوری شمعیں، شمعدان اور فانوس ان کی نفیس طبیعت اور پر ایجاد ذہن کی پیداوار ہے۔ بیمارستان (اسپتال) دنیا میں سب سے پہلے ایران (جند شاپور)

میں بنا اور طب یونانی وہیں سے ساری دنیا میں پھیلی۔

دنیا میں سب سے پہلے مشین ایرانیوں نے ایجاد کی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے آلۂ جرِ ثقیل مشین گن (ایک راؤنڈ میں بارہ فیر کرنے والی بندوق) قلعہ شکن توپ ہوا سے چلنے والی چکی ایجاد کی۔

خط نستعلیق ایرانیوں نے ایجاد کیا جب ایران میں عربی خط (نسخ) رائج ہوا تو اس کی ناہمواری اہل ایران کی نفیس اور حسن پرست طبیعت پر بار ہوئی انھوں نے اس میں گول دائروں اور نوک پلک سے حسن پیدا کیا اور اس کا نام نسخ تعلیق رکھا کیوں کہ وہ نسخ پر تعلیق تھی رخ ثقل کی وجہ سے خارج ہوگئی اور نستعلیق رہ گیا پھر اس میں جدتیں پیدا کیں اور اس کی بہت سی قسمیں ایجاد کیں خط گلزار خط ماہی خط غبار خط طغرا، خط ریحان، خط شفیعہ وغیرہ اور ہر خط کو مضمون کی مناسبت سے استعمال کیا۔

نسخ کو بھی انھوں نے اس کی حالت پر نہیں چھوڑا اس میں بھی ایک حسن پیدا کیا گویا اونٹ کو بنا سنوار کے دلہن بنا دیا۔ مکانوں کی جالیاں اور ٹائل کی زمین ان کی اختراع ہے۔

قالین کی ایجاد بھی ان کی حسن پسند طبیعت کا کارنامہ ہے انہوں نے جیسے قالین بنائے دنیا میں کہیں نہ بن سکے آج بھی وہ اعلیٰ تمدن کا اہم جزو ہے اور اس سے بہتر کوئی ایجاد اب تک نہیں ہو سکی سفید فرش اور اس کا نام چاندنی نورجہاں کی اختراع ہے۔ عطر بھی اسی کے حکم اور تجویز سے بنا اس سے پہلے مشک رکھتے اور غالیہ (خوشبودار بوٹی) بالوں میں ملتے تھے درختوں میں پیوندکاری بھی انھوں نے ایجاد کی۔ راستوں میں میلوں کے نشانات اور کاروان سرائیں انھوں نے بنائیں۔ کھانے میں پلاؤ زردہ مزعفر متنجن شیر برنج انہیں کی ایجاد ہے۔

شاعری میں غزل رباعی اور مثنوی کے وہ موجد ہیں۔

ایران کے تمدن میں انقلاب

صفویوں کے زمانہ میں ایرانی تمدن میں انقلاب آیا شعیت اس میں شدت سے داخل ہوئی اہلبیت سے عقیدت میں ترقی ہوئی شعراء کو مدح اہلبیت میں قصائد اور مصائب میں مرثیہ لکھنے کی ہدایت ہوئی اور اس پر بڑے صلے دیئے گئے علماء کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ سلاطین ان کے سامنے تخت و تاج پیش کر کے ان کی نیابت میں امور سلطنت انجام دیتے تھے اپنی بیٹیوں کی شادی ان کے ساتھ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلبیت مرکز عقیدت بنے صوفیت و امرد پرستی کا خاتمہ ہوا خانقاہیں ویران ہوئیں مجلس و ماتم نذر و نیاز اور تعزیہ داری کو فروغ ہوا۔ یہی زمانہ ہندوستان سے روابط بڑھنے کا تھا شاہ اسمعٰیل نے بابر کی اور شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی مدد کی جس کے نتیجہ میں ترکستان افغانستان اور ہندوستان میں ان کی حکومت قائم ہوئی بابر اور ہمایوں سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ دونوں شیعہ ہوگئے تھے[1] ان کے زمانہ میں ہر شعبہ میں ایرانی نظر آتا تھا اور اپنی صلاحیتوں سے سب پر چھایا ہوا تھا۔

ہندستان کا قدیم تمدن

ہندوستان کے قدیم تمدن میں ہاتھی کی سواری کو بڑی اہمیت تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ شاندار سواری دنیا میں کوئی نہیں۔ جامہ مختلف قسم کی پگڑیاں۔ مٹھائیاں۔ کھانوں میں پوریاں کچوریاں مال پوا دہی بڑے پھلکیاں مزیدار چیزیں تھیں۔ پان بھی یہاں کی خاص چیز ہے جس سے کسی وقت منہ میٹھا پھیکا نہیں رہتا۔ طوائفیں بھی یہاں کی

---

[1] محمد اکبر جوہر ہمایوں کے آفتابہ بردار نے ہمایوں نامہ ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر لکھی جس میں ان لوگوں کو شیعہ ثابت کیا ہے یہ کتاب حیدرآباد دکن اور کراچی سے چھپ چکی ہے۔

دُنیا بھر سے الگ بڑی خصوصیتوں کی حامل تھیں جنسی تسکین کے علاوہ شادی بیاہ اور تفریحی محفلوں کا وہ لازمی جز تھیں ان کا گانا اور ناچنا یہاں کی محفلوں میں ایک سماں باندھ دیتا تھا وہ امراء اور رؤسا کی مقرب اور ان کی تفریح کا سامان تھیں شادی بیاہ کی بھی بہت سی رسمیں یہاں مخصوص تھیں ان سب کو مسلمانوں نے اور ان کی بہت سی باتیں ہندوؤں نے اختیار کر لیں اسی طرح ایک مخلوط تمدن قائم ہوا۔

لکھنؤ کا تمدن

برہان الملک | سید محمد امین ایرانی امیر زادے جوانی میں بیوی سے خفا ہو کے اپنے وطن نیشاپور سے نکلے اور ہندوستان کا رخ کیا یہاں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہت جلد بلندی پہ پہنچ گئے پہلے سعادت خاں پھر برہان الملک بہادر جنگ خطاب ملا ۱۱۳۶ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے ان کے ساتھ بہت سے ایرانی سپاہی اور سردار جو دہلی میں بیکار پڑے تھے لکھنؤ آئے جب یہاں ان کا تسلط ہو گیا تو اپنے اہل خاندان اور لواحقین کو ایران سے بلوا لیا اس طرح لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا ایران آباد ہو گیا یہ لوگ صفوی دور کے ایرانی تھے جو شیعیت میں بہت سخت اور رسم عزا کی بجا آوری میں بڑا اہتمام کرتے تھے اب لکھنؤ میں بھی مجلس و ماتم ہونے لگا جس طرح ایران میں ہوتا تھا۔ اس کی ترقی دیکھ کے دہلی سے مشہور مرثیہ گو حیدری لکھنؤ چلے آئے ان کی مرثیہ خوانی خوب چمکی اور لکھنؤ میں پہلے پہل شیعیت نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے کوئی شیعہ نہ تھا اودھ کے مشہور فلسفی ملا حمد اللہ شیعہ ہو گئے ان سے متاثر ہو کے بعض اور لوگوں نے بھی شیعیت اختیار کر لی۔ برہان الملک خود شاعر تھے اور بہت اچھے شعر کہتے تھے ان کے گرد علماء و شعراء کا مجمع رہتا تھا۔

اور سب ان کی قدر دانی سے خوشحال تھے۔ کئی شاعر ایران سے آئے اور ان کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔

اب لکھنؤ میں جو تمدن قائم ہوا اس میں دہلی سے زیادہ شائستگی اور نفاست تھی کیونکہ یہاں ایران کی نقالی نہ تھی بلکہ اصل ایران آ گیا تھا جس میں شیعیت نمایاں تھی برہان الملک نے سولہ برس اودھ پر حکمرانی کی سنہ ۱۱۵۲ء میں زہر باد سے دہلی میں انتقال ہوا۔

صفدر جنگ | برہان الملک نے اپنے بھانجے مرزا مقیم کو ایران سے بلوا کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا وہ ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ پانچ سال تک مہمات سلطنت میں شریک رہنے کے بعد اپنی بیٹی صدر جہاں بیگم سے ان کی شادی کی برہان الملک کے بعد وہ اودھ کے صوبیدار اور ابدالی کو شکست دینے کے صلہ میں ہندوستان کے وزیر اعظم ہوئے۔ ملکی نظم و نسق اور شجاعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے تمام مورخین ان کی بہادری پر متفق ہیں۔ خود بھی شاعر اور شعراء کے قدر دان تھے ایک ایک شعر پہ ہزاروں روپیہ انعام دیتے تھے علماء اور صاحبان کمال کے مرجع خوبرو و خوش خلق شان و شوکت اور خوش پوشاکی میں مشہور تھے ان کے ہاتھیوں کے گنگا جمنی کارچوبی جھولیں گھوڑوں کے گنگا جمنی ساز و یراق کی ہندوستان میں شہرت تھی میر تقی میر نے ذکر میر میں لکھا ہے کہ "ان کی شان و شوکت بادشاہ سے بھی زیادہ تھی ان کی فوج کے سپاہیوں کی بانات کی وردیاں تھیں اسلحے سے لیس گھوڑے ساز و یراق سے آراستہ تھے دنیا بھر کے سپاہیوں سے زیادہ ان کی تنخواہ تھی اس پر بھی وہ جیالے نوجوانوں کو خفیہ تنخواہ دیتے تھے اور سپاہیوں پر عام بخشش بھی کرتے تھے اس کی شہرت سن کے

نادر شاہ کی فوج کے بہت سے سپاہی اور سردار ہندوستان آکے ان کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔

سخاوت میں بھی وہ مشہور تھے کوئی ان کی داد و دہش سے محروم نہ تھا۔

شام اودھ اجودھیا کے قریب برہان الملک کی فوجی چھاؤنی بنگلہ کو انھوں نے ترقی دے کے شہر بنا دیا اور ایران کے ایک شہر کے نام پر اس کا نام فیض آباد رکھا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان میں سہ پہر کو بازار بند ہو جاتے تھے ایران میں اسی وقت بازار گرم ہوتا تھا اور گیارہ بارہ بجے رات تک چہل پہل رہتی ہے۔ یہی حالت فیض آباد کی بھی تھی یہی شام اودھ ہے جو ہندوستان میں ایک انوکھی بات ہونے کی وجہ سے مشہور ہو گئی۔

سنہ ۱۱۶۵ھ میں ان کو زہر باد ہوا نہایت کرب میں مبتلا تھے مگر اتنا تحمل تھا کہ اس کا اظہار نہیں ہوا انتقال کے بعد لوگوں کو ان کی قوت برداشت پر حیرت ہو گئی کہ مرنے سے کچھ پہلے وہ بڑی شان و شوکت اور سکون و وقار سے بیٹھے دیکھے گئے تھے۔

ان کے زمانہ میں شان و شوکت خوش پوشا کی لکھنؤ کے تمدن میں داخل ہوئی اور ان کے بعد اذیت کا تحمل اہلِ لکھنؤ کی وضع بن گیا کراہنا اور ہائے وائے کرنا بزدلی سمجھا جانے لگا۔

جنگ شجاع الدولہ سنہ ۱۱۶۵ھ میں جلال الدین حیدر شجاع الدولہ اپنے والد منصور کے بعد حاکم اودھ ہوئے۔ فنون حرب اور جسمانی قوت میں یکتائے زمانہ تھے ایک ضرب میں بھینسے کی گردن اڑا دیتے تھے گوسفند کا گلا جیڑ ڈالتے تھے۔ روپے کے حرف چٹکی سے مسل کے مٹا دیتے تھے انھوں نے فوج کی تعداد بڑھائی توپ اور بندوق ڈھالنے کے کارخانے قائم کئے عام طرز زندگی

میں سپاہیانہ بانکپن پیدا ہوا اور فیض آباد کی آن مشہور ہوئی ایرانی طرز کے چار سو باغ اور سیر گاہیں بنائیں جن کی اتنی شہرت ہوئی کہ شاہ عالم ان کو دیکھنے آئے۔

شعر و سخن کے دلدادہ اور اہل کمال کے قدر داں تھے دہلی کی ابتری سے اہل کمال نے فیض آباد کا رخ کیا اور انھوں نے ان کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ان باتوں میں اپنے پیش رووں سے بڑھ کے قدم مارا

وہ ایرانی ہونے کے ساتھ ساتھ دہلوی بھی تھے ان کی بیوی اور ماں ایرانی باپ کی بیٹیاں ضرور تھیں مگر دہلی میں پیدا ہوئی تھیں خود شجاع الدولہ نے دہلی میں آنکھ کھولی۔ امرائے دہلی کے اکثر ذوق ان میں موجود تھے قیمہ پرند و جانوروں کی لڑائی ان کی بہترین تفریح تھی ارباب نشاط سے دلچسپی کی شہرت دور دور پہنچی کشمیر کلکتہ اور اطراف ملک سے اتنی حسین و جمیل طوائفیں آئیں کہ ان سے فیض آباد کی گلیاں کوچے بھر گئے۔ کسی عورت کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس حکم میں طوائفوں پر پابندی مقصود تھی وہ اپنے کو قید نہ سمجھیں اس کے لئے ان پر طرح طرح کی نوازشیں ہوئیں اور بغیر کسی خدمت کے انعام و اکرام کا دستور قائم کیا کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں۔

سیر و شکار میں حرم سرا ارکان سلطنت فوج کا ایک بڑا حصہ شہر کے خوش باش امیر رسد کے لئے ہر طرح دوکاندار ساتھ ہوتے تھے ہر منزل پہ بازار لگ جاتا طوائفوں کے ڈیرے نصب ہو جاتے اور جنگل شہر بن جاتا۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ طوائفوں کی کتنی کثرت تھی اور وہ زندگی کا ایک جزو بن گئی تھیں۔

ان کے گھر میں ایرانی فضا تھی ان میں متانت و وقار سنجیدگی اور

بلند نظری تھی طوائفوں سے اتنی دلچسپی اور قدردانی کے بعد بھی انہیں تہذیب و متانت کے حدود سے تجاوز کی اجازت نہ تھی وہ یہاں آکے پہلے تہذیب سیکھتیں ادب تعظیم کے طریقے دیکھتیں اس کے بعد کسی رئیس کے سامنے آنے کے قابل ہوتیں۔

شجاع الدولہ کے سالے سالار جنگ کھانے کے بڑے شوقین تھے ان کی وجہ سے اہلِ لکھنؤ میں کھانے کا ذوق پیدا ہوا دور دور سے باورچی آئے اور بڑے لذیذ و تکلفی کھانے پکنے لگے۔

مذہبی حیثیت سے ہندو مسلمان دو فرقے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کے بہت سے رواسم اختیار کر رکھے تھے۔

سنی شیعہ کی تفریق نہ تھی شیعہ تھے تو مگر کوئی علیحدہ قوم نہ تھے نکاح طلاق دفن کفن سب اہلِ سنت کے طریقہ پر ہوتا تھا نماز جماعت وغیرہ کچھ نہ تھی کیونکہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا۔

مذہبی رواسم میں پیری مریدی عرس قوالی بڑے پیر کی فاتحہ میراں جی کے گلگلے شیخ سدو کا بکرا سید احمد کبیر کی گائے مدار صاحب کی کندوری سید سالار کا جھنڈا شیعہ سنی دونوں کے مذہبی رواسم تھے۔

محرم میں دس دن تعزیہ داری بھی سب مل کے ایک ہی طریقہ پر کرتے تھے۔ صرف شجاع الدولہ کا علم عام طریقہ کے خلاف اٹھتا تھا لمبی چھڑ میں بڑا سا علم اس کی گردن میں کمان کے بیچ کا حصہ مضبوط بندھا ہوا جس کے دونوں سروں پہ ذوالفقار لٹکتی ہوتی تھی اس سے کچھ نیچے چھوٹی سی مشک اس کے نیچے پرچم اس کے نیچے پھریرا سیاہ یا سفید شہاب جھنڈ کا ہوا شجاع الدولہ یہ علم لے کے سیاہ لباس میں سر و پا برہنہ

ماتم کرتے نوحہ پڑھتے گشت کرتے تھے۔

عزاداری کا یہ طریقہ شجاع الدولہ کے زمانہ سے شیعوں میں رائج ہو گیا۔ سپاہیانہ بانکپن خوش پوشاکی خوش خوری شان و شوکت تہذیب و متانت کرب و اذیت کی اتنی برداشت کہ اس کا اظہار نہ ہو شعر و شاعری کے ساتھ رقص و سرود اور اربابِ نشاط سے دلچسپی لکھنؤ کے تمدن میں داخل ہوئی۔ ۱۱۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

آصف الدولہ | شجاع الدولہ کے فرزند اکبر مرزا یحییٰ آصف الدولہ رستم جنگ ۱۱۸۸ھ حکمراں ہوئے ایک سال کے اندر فیض آباد چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے اور باون گاؤں ملا کے اس کو وسیع کیا نئے محلے عمارتیں اور باغ ایسے عالیشان اور اتنی کثرت سے بنوائے کہ لکھنؤ دنیا کا سب سے بہتر شہر سمجھا جانے لگا۔ بڑے دیندار سخی بہادر شاعر اور فنِ تاریخ و سیر میں کامل تھے۔ ان کے زمانہ میں بڑے بڑے اہلِ کمال لکھنؤ آئے اور شعر و سخن کا ذوق بڑھا۔

ان کو تعزیہ داری سے بڑی دلچسپی تھی اپنا عظیم الشان امام باڑہ بنوایا محرم میں وہ تعزیہ کی زیارت کو نکلتے تھے ہر تعزیہ پر کچھ چڑھاتے تھے یہ یہ طریقہ عام ہو گیا اوروں نے بھی اسے اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا شہر تعزیہ خانہ بن گیا مجلسیں بڑے اہتمام سے ہوتی تھیں ایران تک سے حدیث خواں واقعہ خواں روضہ خواں اور کتابخواں آئے۔

پہلے شیعہ مجتہد | ان کے زمانہ میں مولانا دلدار علی (غفرانمآب) عراق و ایران سے مذہبی علوم کی تکمیل کر کے آئے اور لکھنؤ میں قیام کر کے شیعوں کی جمعہ و جماعت قائم کی نکاح طلاق دفن کفن سب ان کے طریقہ پر ہونے لگا۔

شیعیت اور صوفیت میں کوئی حد فاصل نہ تھی علمائے عراق نے اس موضوع پر کچھ نہیں کہا علمائے ایران میں ملا محمد باقر مجلسی نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی۔ علامہ محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی قوالی کے جواز کے قائل تھے۔ قاضی نور اللہ شوستری نے بھی صوفیا کی بڑی حمایت کی ہے شیخ علی حزیں بھی صوفیت کے حامی تھے۔

غفرانمآب پہلے شیعہ عالم ہیں جنھوں نے آصف الدولہ کے زمانہ میں صوفیت کے خلاف مہم کا آغاز کیا ایک مستقل کتاب (شہاب ثاقب) لکھی اور تقریر وتحریر سے یہ ثابت کیا کہ صوفیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں صوفیا گمراہ ہیں سوائے آئمہ اہلبیت کے کوئی مرکز عقیدت بننے کے قابل نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا عرس قوالی بڑے پیر کی فاتحہ شیخ سدو کا بکرا ابراہیم کبیر کی گائے غازی میاں کا جھنڈا اور چادر۔ گاگر وغیرہ رواسم جو شیعوں میں رائج تھے وہ چھوڑ دیئے گئے ان کی جگہ حاضری علم تعزیے اور آئمہ و شہدائے کربلا کی نذر ونیاز ہونے لگی۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کے تمدن میں کسی خاص چیز کا اضافہ نہیں ہوا مگر ہر چیز میں ترقی ہوئی غفرانمآب کی کوشش سے شیعیت کو بڑا فروغ ہوا اور غزل میں بھی عورت سے عشق یا بہیانہ بانکپن اور شیعی عقائد کا اظہار کیا جانے لگا۔ میر تقی میر نے تو مناظرانہ نوک جھونک سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ باغ فدک خلافت بلافصل وغیرہ کا ذکر ان کی غزلوں میں موجود ہے۔
سنہ ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا۔

یمین الدولہ سعادت علیخاں آصف الدولہ کے بعد ان کے سوتیلے بھائی سعادت علیخاں سنہ ۱۲۱۲ھ کو مسند حکومت پر بیٹھے وہ بہت بڑے عالم مفکر فلسفی سیاستداں اہل کمال کے سرپرست تھے رقص وسرود اور حسن پرستی کی فضا میں انھوں نے پرورش پائی تھی شعر وسخن کی فضا میں آنکھ کھولی تھی نفاست وپاکیزگی

ذوق ان کے گرد وپیش پھیلی ہوئی تھی سنجیدگی ووقار ان کی فطرت تھی۔ اس وقت تک رات کو سواری کے ساتھ مشعلوں کا رواج تھا انھوں نے سونے چاندی کی نئی سو لالٹینیں بنوائیں جن میں شمعیں جلتی تھیں یہ خوبصورت چھڑوں میں ان کی سواری کے ساتھ رہتی تھیں۔

شجاع الدولہ کے زمانہ سے ناچ گانے اور طوائفوں سے دلچسپی امرائے اودھ کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سعادت علی خاں ایسا متین وسنجیدہ شخص بھی اس سے نہ بچ سکا صبح کو اجلاس کے وقت ایک طرف امرائے دربار فوجی افسر کاغذات لیے حاضر رہتے تھے دوسری طرف طائفے رقص وسرود میں مشغول راگ الاپنے میں مشغول رہتے تھے نوبت ونقارے کی آواز اس پر مستزاد تھی اور وہ کام کرتے میں اٹھ اٹھ کے کھڑکیوں میں سے دیکھتے رہتے تھے یہی حالت تمام امراء کی تھی عوام کو بھی اس سے بڑی دلچسپی تھی اس وجہ سے طوائفوں کی بڑی کثرت ہوگئی ان کو شہر سے باہر جانے کی ممانعت تھی نواب کا خیال تھا کہ یہ شہر کی رونق ہیں حکومت اور رؤسا کی طرف سے ان کو بغیر کسی خدمت کے انعامات ملتے رہتے تھے۔

زبان کے معاملہ میں بھی ان کا ذوق بہت پاکیزہ تھا شوکت الفاظ کے ساتھ بلیغ مختصر معنی خیز اور مرصع فقرے برجستہ ان کی زبان سے نکلتے تھے۔ وہ ملائی کو بالائی کہتے تھے انشاء نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ:

> "حضور پرنور کی اردو میں تحریر وتقریر مقامات حریری کی یاد دلاتی ہے۔ نہ کوئی ایسا فصیح زبان اور شیوا بیاں پیدا ہوا نہ ہوگا کسی وقت ان کی بات لطیفہ سے خالی نہیں ہوتی کبھی طباق کبھی ایہام کبھی ترشیح کبھی محتمل الضدین"

بظاہر یہ خوشامد معلوم ہوتی ہے مگر سچ پوچھیے تو ان کی ادبیت کا حق ادا نہ ہوسکا حریری نے انشاء پردازی کی ہے اور سعادت علی خاں کی معمولی بات چیت اور روزانہ کے احکام ہیں یہ بات حریری کو کہاں نصیب ہوئی انھوں نے قانون بنایا کہ جو منشی املا کی غلطی کرے اسے فی حرف کے ہم عدد دام جرمانہ کیا جائے۔ ایک نیا منشی نوکر ہوا اس نے بہ نوع کو "بہرنو" لکھدیا تحریر نظر سے گذری اس پر حکم لکھا،

"منشی نو لفظ نوع را بطرز نو نوشتہ عین خطا کرد ہفتاد روپیہ جرمانہ"

ایسی برجستہ عبارت بڑے بڑے انشا پرداز نہیں لکھ سکتے" سرکاری درزی نے اضافہ تنخواہ کی درخواست دی اس پر حکم لکھا ؏

گر زمیں را با سماں دوزی ندہندت زیادہ از روزی

جان بیلی صاحب فارسی دانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے خود بھی ان کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا سعادت علی خاں کے مختصر معنی خیز اور مرصع جملوں کی شہرت تھی بیلی صاحب جب رزیڈنٹ ہو کے لکھنؤ آئے تو کہا تو یہی میں ان سے مختصر سوال کروں اور انھیں طولانی جواب دینا پڑے اپنے دل میں کچھ سوال مرتب کئے جب ملاقات کو آئے تو سلام، مزاج پرسی کے بعد پوچھا۔

آپ کے عجائب خانہ میں کون کون سے جانور ہیں؟ از شیر تا میٹر۔

آپ کے مُلک کے کیا حدود ہیں۔؟ از سنگ تا گنگ (ہمالیہ، گنگا)

بیلی صاحب حیران ہو گئے اور پھر کسی سوال کی جراءت نہ ہوئی۔

سعادت علی خاں کا یہ انداز تحریر و تقریر بحد مقبول ہوا خاص و عام سب معمولی گفتگو صنائع و بدائع میں کرنے لگے۔ سودا بیچنے والوں کی صدائیں مشہور ہیں۔

علماء کی تقریر و تحریر بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوتی تھی سلطان العلماء مجتہد العصر کی تصنیفیں ایسے فقروں سے بھری پڑی ہیں ان کی روزانہ کی گفتگو اور مقدمات کے فیصلے بھی اسی رنگ میں ہوتے تھے۔

مُتی طوائف بدکاری جُرم میں گرفتار ہوئی جُرم ثابت ہوا فیصلہ میں لکھا

مُتی بالتضم والتشدید[1]

ایک حکیم مہتا نے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرلیا اس کی شکایت صحیح ثابت ہوئی فیصلہ میں لکھا۔

"حکیم صاحب رفع قبض نمایند"

یہ انداز تقریر و تحریر لکھنؤ کے تمدن کا ایک جزو بن گیا۔

سعادت علی خاں کو اپنے باپ دادا اور بھائی کی طرح عزاداری سے بڑی عقیدت تھی وہ محرم بہت اہتمام سے مناتے تھے۔ ابتک صرف دس دن محرم میں تعزیہ داری ہوتی تھی انھوں نے چہلم بھی قائم کیا تال کٹورے کی کربلا اور حضرت عباس کی درگاہ بنوائی۔

میر سید علی نے سوز خوانی میں وہ کمال پیدا کیا کہ لوگ حیران ہو گئے اور لکھنؤ میں سوز خوانی نے ایک اعلیٰ فن کی حیثیت اختیار کی۔

ایک نیا شہر انگریزی طرز کا آباد کیا۔ بڑے بڑے شعراء دہلی سے آئے اور مختلف سرکاروں سے وابستہ ہوئے۔

پرکاش نے بنارس سے پرناچ کے لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا

---

[1] مُتی بُرائی میں شدّت سے ملوث ہوئی۔

۱۲۲۹ھ کو سعادت علی خاں کا زہر سے انتقال ہوا۔

غازی الدین حیدر غازی الدین حیدر سعادت علی خاں کے فرزند اکبر اپنے باپ کے بعد ۱۲۲۹ھ میں مسند حکومت پر بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی شاہی کا اعلان کیا اپنے نام کا سکہ ڈھلوایا۔ دو کروڑ میں تاج و تخت اور گنبد زرنگار تیار ہوا اٹھارہ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ کو تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ سلطان العلماء مجتہد العصر نے اپنے دست مبارک سے تاج شاہی ان کے سر پر رکھا اور پہلا حکم کچھ سادات کی تنخواہ کا شاہی قلم سے صادر ہوا شاہ زمن لقب اختیار کیا۔ وہ بڑے شجاع و بہادر عالم و فاضل علماء و فضلا کے سرپرست و مرجع تھے۔

شاعری سے بھی دلچسپی تھی حمد نعت اور مرثیہ زیادہ کہتے تھے غزل میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی کی ایک بلند پایہ لغت (ہفت قلزم) کے مصنف ہیں ایک عربی لغت (تاج اللغات) مستند علماء سے لکھوائی۔

ٹائپ کے حرفوں کا چھاپے خانہ اور کنواری لڑکیوں کی شادی کا محکمہ قائم کیا۔ طبیعت نفاست پسند اور جدت طراز تھی کپڑوں کے ذوق کی بشپ ہیبر نے بہت تعریف کی ہے ایک ٹوپی مندیل کی قسم کی ایجاد کی گھوڑے اور مچھلی کی شکل کی کشتیاں بنوائیں ہاتھی کا ایسا ہودا بنوایا جو چاروں طرف گھومتا تھا گینڈے پر ہودا رکھ کے سواری کی بے طناب کا خیمہ بنوایا۔ حقہ کا نام حسنِ محفل رکھا نجف اشرف قدم رسول اور سعادت علی خاں کا مقبرہ تعمیر کرایا نہر کھدوائی اور اس میں پانی کے لیے انجن منگوایا ان کے زمانہ میں شہر کی بہت رونق بڑھی۔

آداب نشست و برخواست اور لوازم تعظیم و تکریم سخت ہو گئے چھینکنا کھانسنا۔ جماہی لینا کھجانا بے تحاشا ہنسنا خلاف تہذیب قرار پایا خطاب و جواب میں بڑی لچک اور دلکشی پیدا ہوئی سلام و مزاج پرسی کے انداز میں اشتیاق اور خلوص کا مفہوم پیدا ہوا سنجیدگی متانت کی پابندی لازمۂ شرافت تھی۔ غیر مہذب آدمی شرفا کی محفل میں بیٹھنے کے قابل نہ تھا اس وجہ سے ہر شخص کو آئین تہذیب کا معیار بننا پڑا مصاحب لواحقین گفتگو خاص طور پر مہذب ہو گئے یہ بات صرف دربار اور امیروں کی سرکار تک نہ رہی بلکہ عام ہو گئی اس کا اثر یہ ہوا کہ بازاری اور مکروہ لفظیں لونڈا۔ لیٹر۔ چانٹا۔ چوتڑ۔ جوڑو۔ بھڑوا۔ ابے وغیرہ زبان سے خارج ہو گئیں نقل قول کی ضرورت پر موزوں الفاظ سے کام لیا جاتا ہے یہ معیار تہذیب دہلی میں کبھی نہ تھا۔

فن سپہ گری کو ترقی ہوئی لوگ عموماً سپاہیانہ وضع میں رہنے لگے شعر و شاعری کا ذوق بڑھا علوم و فنون کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا علما، شعراء اطبا اور دوسرے صاحبان فن دور دور سے آئے اور قدر دانی سے سرفراز ہوئے نفاست اور پاکیزگی ذوق کا شعور پیدا ہوا تعزیہ داری کو ترقی ہوئی بادشاہ نے حضرت علی کے روضہ کی نقل تعمیر کرائی اور اس کا نام شاہ نجف رکھا انگلینڈ سے بلور سبز کی ضریح ڈھلوا کے منگوائی علم و تعزیے کے ساتھ یہ ضریح بھی اٹھائی جاتی تھی۔

۱۲۴۲ھ میں ان کا انتقال ہوا اپنے بنوائے ہوئے امام باڑہ (شاہ نجف) میں دفن ہوئے لالہ صاحب رائے فریاد نے تاریخ کہی

حیدر بنجف مقام بگرفت

نصیر الدین حیدر غازی الدین حیدر کے اکلوتے بیٹے نصیر الدین حیدر ۱۲۴۲ھ میں

تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور سلیمان جاہ لقب اختیار کیا سلطان العلماء سید محمد رضا مجتہد العصر نے تاج پہنایا۔ وجیہہ و شکیل رعب شاہی چہرہ سے نمایاں اعلیٰ درجہ کے شہسوار اچھے پیراک اور خوشگو، شاعر تھے بادشاہ تخلص تھا ان کا دربار بڑے رعب و داب کا دربار تھا کسی کو چھینک آ گئی تو اس کی ناک کٹوائی[1] طبیعت میں بڑی نفاست اور خوشبو سے بہت رغبت تھی عطر اور پھول کا استعمال عجیب عجیب طرح کیا خس کی ٹٹیوں پر کیوڑہ اور گلاب چھڑکا جاتا تھا عطر کے فوارے چھوٹتے تھے اور حوض بھرے جاتے تھے ہزاروں کا ری باغوں کے علاوہ سیکڑوں روپیہ کے پھول روزانہ بازار سے آتے تھے[2] مزاج میں اتنی نزاکت تھی کہ بیلے کے تیل کی خوشبو ناگوار ہوئی۔

خوبصورت عورتوں کو جمع کرنے اور انھیں آراستہ رکھنے کا بے حد شوق تھا کئی ہزار کہاریاں پہرہ دارنیاں خواصیں اور کنیزیں تھیں جو بہت بناؤ سنگھار سے رہتی تھیں ان کی لونڈیوں نے جو لباس پہن ڈالا وہ مغل اعظم کی ملکہ اور شہزادیوں کو نصیب نہیں ہوا ایک ایک دوپٹہ چار چار ہزار کی لاگت کا ہوتا تھا[3]

رفاہ عام کا بڑا خیال تھا شہر کے ناداروں کا وظیفہ معین کیا انگریزی اسپتال یونانی شفا خانہ۔ محتاج خانہ اپاہج خانہ بنوایا جو ابتک موجود ہے۔ گومتی پر لوہے کا پل بنوایا۔

علم نجوم کے بڑے ماہر تھے رصد خانہ سلطانی تعمیر کرایا اور زیچ سلیمان جاہی مرتب کرائی۔

لیتھو کا چھاپہ خانہ کھولا ڈرامے کی بنیاد قائم کی رقص و سرود کو ترقی

---

[1] لکھنؤ میں چھینکنے پر ناک کٹنا محاورہ اسی بنا پر ہے فسانۂ عبرت [3] تاریخ اودھ

اور عالموں کی کثرت ہوئی شعر و سخن کا ذوق اور سپہ گری شوق بڑھا سلاح شہر ہتھیار بند ہو گیا تعزیہ داری کو بہت عروج ہوا۔ ذوالجناح اور مہندی نکالنے کی ابتدا کی آٹھویں ربیع الاول تک ایام عزا قرار دیے ایک عالیشان کربلا تعمیر کرائی میر ضمیر نے تحت لفظ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

اہلِ بیت سے مودت اور عقیدت عام تھی اہلِ سنت تفضیلی تھے ہندو مسلمان سب تعزیہ داری کرتے تھے پہرہ وار علم حیدر جاگو کہہ کے پہرہ دیتے تھے فقیر مناقب پڑھ کے بھیک مانگتے تھے یہ لکھنؤ کے شباب کا زمانہ کہا جاتا ہے اس وقت لکھنؤ کا تمدن یہ تھا۔

لباس کا شوق۔ عطر کا ذوق۔ سپہ گری میں مہارت ہتھیار سے لیس شہسواری بٹیر بازی مرغ بازی عشق و عاشقی شعر و شاعری رقص و موسیقی علوم و فنون کی قدر جسمانی تکلیف کا اتنا تحمل کہ زبان سے ہائے وائے نہ نکلے خوش خوراکی اور کم خوری مفلسی کو چھپانا۔ اپنے کو خوشحال ظاہر کرنا ادب و تعظیم کا لحاظ رفتار و گفتار میں سنجیدگی وقار بازاریوں کے الفاظ سے پرہیز نکتہ رسی و بذلہ سنجی خلق و انکسار باتوں میں اپنی تعریف اور نمائش کا پہلو نہ آنے دینا گفتگو میں تشبیہ و استعارہ صنائع کا صرف شعروں اور مصرعوں کا برمحل استعمال ہر بات میں اپنے اوپر نگاہ احتساب کہ کوئی فعل نفاست و سنجیدگی کے خلاف سرزد نہ ہو۔ اس معاشرہ میں نسلیں گذر گئیں ذہن اس سانچے میں ڈھل گئے سپہ گری کی آن بان کے ساتھ خلق و انکسار عشق و عاشقی اور رقص موسیقی کے ساتھ تہذیب و وقار نفاست و نزاکت مزاج بلند نظری جدت اور جودت طبع حاضر جوابی نکتہ سنجی فصاحت و بلاغت اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت اور شناخت بن گئی۔

ناسخ کی شاعرانہ صلاحیتیں اسی فضا میں ناسخ نشو و نما پائی ان میں فصاحت کا شعور ذوق سلیم شاعرانہ صلاحیت جدت طبع بے انتہا تھی ان کی فطری صلاحیتیں لکھنؤ کی تہذیب نفاست کے سانچے میں ڈھل کر بیسیویں ذوق کی شکل میں نمودار ہوئیں جس کا لکھنؤ کی تہذیب تقاضا کر رہی تھی انھوں نے زبان کی صفائی و پاکیزگی کے ایسے قاعدے بنائے اور ان پر عمل کر کے فصاحت و بلاغت کا ایسا معیار قائم کیا کہ لوگوں کو ان کی تقلید سے گریز ممکن نہ ہوا۔ شاعری میں مضامین کی سنجیدگی اور ادارے مطلب میں جدتوں سے ایسی دلکشی پیدا کی کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی ہر جگہ کے شاعر نے اس کی تقلید کی کہنہ مشق اپنے انداز کو چھوڑ کے ان کی پیروی کرنے لگے مصحفی ایسے استاد کل اتنا مرعوب ہوئے کہ سر مشاعرہ ان سے غزل پڑھنے کی اس طرح فرمائش کی ؎

ہاں مگر شیخ کی خدمت میں یہ ہے اپنا سوال جو پڑھ چکے ہم تو کچھ اب آپ عنایت کیجے

معلوم ہوتا ہے کہ غزل کہتے وقت ناسخ کا اتنا رعب تھا کہ نہیں معلوم وہ اس زمین میں کیا کیا گلکاریاں کریں گے عنایت کیجے کے قافیہ میں دل کی بات بے اختیار زبان پر آگئی۔

اپنے چھٹے دیوان کے مقدمہ میں ان کی تقلید کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے:۔

تخلص خود را اسم بامسمیٰ نگاشتہ بر طرز ریختہ گویان
ساده کلام در عرصہ قلیلے خط نسخ کشیده ــــــــــ
غزلیات ایں دیوان ششم را اکثرے بر وتیرہ ایشاں گفتہ

غالب ایسا مغرور شاعر جو بڑے بڑوں کی حقیقت نہیں سمجھتا کسی کی جھوٹی تعریف کو بھی کہتا اور اپنے لیے اس کو ننگ و عار جانتا ہے ناسخ کے

آفتاب کمال کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے اور ان کو موجد و مجدد و مصلح زبان و شاعری تسلیم کرتا ہے۔ عبدالغفور نساخ کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک اور گستاخ ہیں شیخ امام بخش ناسخ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔"

ناسخ کو اپنے دیوان کے ساتھ جو خط بھیجا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے وہی عقیدت ٹپکتی ہے جو ایک لائق شاگرد کو اپنے باکمال استاد سے ہونا چاہیے۔

غالب کا خط ناسخ کے نام

"ایں ورقہائے بخون جگر نگار بستہ ارمغانیست بغالب جگر خستہ بحضرت خدام والا مقام سخن سنج۔ سخنی نیا ہاں امید گاہ بے نظاں نظام ظہوری ظہور۔ نظیری نظیر فیضی فیض۔ ضمیری ضمیر۔ شافی شان نوائی نوا۔ فغانی فغاں۔ در علم صائب و در عمل راسخ مخدوم معظم مطاع مکرم۔ مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختہ اند و در ریختہ نقش بدیع انگیختہ او فرستادن ایں فہرست نادانی بداں دانا آموزگارانہ از ان رواست کہ طبع آہنگ نمائش و ہمت بعرض تجمل گرائش دارد بلکہ نامہ نگار درین پردہ سگالے است کہ غیر ایں تیرہ بخت سرانجام قلم و تحریر بلبغاں نگاه قبول مولانا رو شئے اندوزد و انچہ بجز لک انصاف قابل ازیں اوراق بستردن نوسیدہ است بغازه تحسین مخدوم رخ امتیاز افروزد ــــ"

ناسخ نے اپنا دیوان مرزا موسیٰ جان کے ہاتھ غالب کو بھیجا تھا اس کا شکریہ جن الفاظ میں ادا کیا ہے اس کے ضروری اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"ندانم چہ می نگارم کہ دریں نگرستن نگاہ از ناز بدیدہ درنمی گنجد و دریں نگارش خامہ از شادی در بنان می رقصد۔ بخت را رسائی ستایم و پندارم کہ بطور معنی رسیدہ ام و خود را بگمان ما یگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ را ید بیضا دیدہ ام۔

زہے دیوان کہ سوادش از دودۂ چراغ طور است و غلافش از دیبائے حلہ حور ہمہ معنی را گنجینہ۔ چوں بگوئی خواہ نامہ گراو در نگارندہ ایں نکیم شادم کہ ایں نامہ در میں نقش است از آں خامہ اگر ان تحقیق نامہ دلپذیر نبودے مرا ایں را بچنیں نظیر نبودے۔

آرے ہر متاعے را کہ بیک نائے نام برادر دگر بچشم زخمش ہمہ بیشتر آید سبحان اللہ سخن بروز گار مخدوم بپایہ بلند بود دارد و بار رونق دیگر مزید آمد۔"

(پنج آہنگ)

اس خط میں غالبؔ نے ناسخؔ کے مقابلہ میں اپنی ہیچ میرزی اور ان کے کمال کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے بہت مرعوب تھے اور ان کے مقابلے میں کسی شاعر کی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ کچھ انھیں پر موقوف نہیں اس وقت کے تمام ادبا و شعراء ان کے طرز سخن کے شیدا اور اس کی تقلید حسن کلام کی ضمانت سمجھتے تھے دہلی کے مستند اہل زبان اور قادر الکلام شاعر مرزا قادر بخش صابر گلستان سخن میں یوں زمزمہ سرا ہیں۔

"گرسنہ ہنر اس کے مائدہ سخن سے زلہ ربا دعویداران کمال اس کی شوکت الفاظ سے پائمال اہل انصاف اس کو استاد مانتے اور ارباب فہم اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں۔"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ گلشن بے خار میں یوں نغمہ طراز ہیں۔

"نسیم طبعش نکہت ریز۔ شمیم گل فکرش دل آویز۔ طائر بلند پرواز غورش جز بشاخ سدرہ آشیانہ نسازد۔ و مرغ تیز بال خیالش جز ببام فلک جلوہ نیاندازد۔ والا مایہ۔ بلند اندیشہ۔ نازک خیال و در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و بے مثال"۔

مؤلف تذکرہ بہارِ بے خزاں یوں گل فشانی کرتے ہیں:۔

"سحر بیان استاد نزاکت بنداں زبان بود"

تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"ناسخ رسم کہن مجتہد شعر و سخن۔ صاحب رائے سلیم یادگار رضا و کلیم خلاق معانی شیریں بیان مرحوم مغفور شیخ امام بخش ناسخ"۔

مؤلف بہارستان اودھ رقمطراز ہیں:۔

شیخ امام بخش ناسخ سر دفتر شعرائے عظام لکھنؤ مانا گیا ہے فصاحت و معنی آفرینی میں یکتائے روزگار تھا فکر رسا اور بلاغت کلام میں مرزا صائب اور ملا ظہوری سے گوئے سبقت لے گیا ہے

طرز اندیشہ آفریدہ اوست   در تن لفظ جان دمیدۂ اوست

نصر اللہ خان خویشگی گلشن ہمیشہ بہار میں لکھتے ہیں۔

شاعر غرا کلامش از سقم معرا طبعش نکہت انگیز فکرش دل آویز والا مایہ عالی پایہ بلند اندیشہ

ناسخ کی زبان و شاعری کے قبول عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کا کلام لکھنؤ کا تحفہ سمجھا جاتا تھا شیفتہ ان کے حال میں لکھتے ہیں:۔

جدید غزلوں کے بھی دو تین اشعار جو بعض احباب تحفتہً لکھنؤ سے لائے

تھے قلم بند کئے گئے۔"

(گلشنِ بیخار)

صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں غالب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ناسخ کا کلام دہلی پہنچا تو ایک دھوم مچ گئی، میں نے اور مومن نے ان کا متبع ہونا چاہا۔

اتنی پسندیدگی کی وجہ سمجھنے کے لئے انہی لوگوں کے بیانات پر غور کرنا چاہیئے۔

مصحفی:۔ طرزِ جدید کے موجد متقدمین کے کلام پر خطِ نسخ کھینچ دیا۔

غالب:۔ طرزِ جدید کے موجد۔ پرانی ناہموار روشن کے ناسخ۔ شاعری کو پایۂ بلند پر پہنچایا۔ اردو کے قالب میں روحِ تازہ پھونکی"۔

شیفتہ:۔ ان کا کلام دل آویز۔ ان کی فکر بلند۔ خیال نازک۔ تلاش مضمون تازہ اور معنی سیراب میں بے مثال۔

نصراللہ خان:۔ طبع نکہت انگیز فکر دل آمیز۔ بلند اندیشہ۔ نازک پیشہ۔

مرزا قادر بخش صابر:۔ شوکتِ الفاظ سے ان کا کلام سحر ہے"۔

سعادت ناصر خان:۔ ناسخ رسم کہن خلاقِ معانی۔

بہارِ بے خزاں:۔ سحر بیاں استادِ نزاکت بندانِ زباں بوستان اودھ۔ بہ نصاد جدتِ معنی آفرینی میں یکتائے روزگار امیرزادہ صائب اور ملا ظہوری سے بازی لیگئے۔

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک بلند پروازی معنی آفرینی نازک خیالی طرزِ ادا میں جدت اور زبان میں فصاحت و بلاغت تھی کی وجہ سے ناسخ کے کلام میں دلکشی ہے اور یہی باتیں شاعری کی جان ہیں یہی دہلی و لکھنؤ کا فن ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لکھنؤ میں یہ فن سنجیدہ صاف ستھرا اور معراجِ کمال پر پہنچا ہوا ہے اس کی تفصیل لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنے میں مدد دے گی۔

زبان میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ گنواری بازاری۔ بھونڈی۔ بھدی لفظیں اور ترکیبیں ترک کیں۔

۲۔ تذکیرو تانیث کا تعین بڑے سلیقہ سے کیا۔

۳۔ علامات فاعلیت وغیرہ کا ترک ممنوع قرار دیا۔

۴۔ حرف کا دبنا۔ گرنا اور بڑھنا ترک کیا۔

۵۔ تعقید اور اضمار قبل الذکر سے پرہیز کیا۔

ان اصلاحوں سے زبان میں روانی سلاست اور صفائی پیدا ہوگئی۔

۶۔ شعر کی ایک خاص زبان بنائی۔

لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ میں دو زبانیں بولی جاتی ہیں ایک گھر کے اندر کی زبان ہے جسے اہلِ لکھنؤ کی مادری زبان کہنا چاہیئے اس میں عربی فارسی لفظوں تشبیہوں استعاروں اور صنعتوں کا بڑا ہلکا پھلکا استعمال ہے بچے بوڑھے عورت مرد سب یہی زبان بولتے ہیں۔ مثلاً مزاج عالی مزاج اقدس گھر کے اندر کی زبان نہیں اس کی جگہ مزاج اچھا ہے؟ مزاج کیسا ہے؟ کہتے ہیں بڑے بڑے علما گھر کے اندر اسی سادی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔

ہم آپ کو لکھنؤ کی دو ہمسائیوں کی بات چیت سناتے ہیں ایک ہمسائی اپنے گھر کی کھڑکی سے دوسری ہمسائی کے گھر آئی ہیں۔

بہن تسلیم۔ تسلیم مزاج اچھا ہے آج کدھر بھول پڑیں؟ کیا بتاؤں سارا دن الم غلم میں گزرتا ہے گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی آج سب کاموں کو تج کے آئی ہوں۔ بٹیا کہاں ہیں؟ کمرے میں سو رہی ہیں رات کو باجی اماں کے یہاں رتجگے میں گئی تھیں۔ ماشاء اللہ کیا سن ہے؟ خدا رکھے ڈگنا برس ہے

اللہ سلامت رکھے اب تو شادی کا سن ہو گیا کہیں سے بات آئی ہے ؟

ہاں چچا کے لڑکے کا پیام ہے مگر وہ شہدہ پاک پنج عیب شرعی نہ کماتا ہے نہ کجاتا ہے۔ کنکیا ہے اور وہ ہے محلے لقندرے گھیرے رہتے ہیں باپ کی دولت ہے جو ہوا میں اُڑ رہی ہے۔

باپ دیتے کیوں ہیں ؟ اے لو۔ کیوں نہ دیں چہیتے ہیں اکلوتے ہیں۔

نوج۔ "ایسی چاہت پر خدا کی مار" جو بچے کو برباد کر دے خدا رکھے بہن کا لڑکا بھی تو سمجھدار ہو گیا۔

دوسری بیوی۔ آپ کہاں رہتی ہیں اس کی تو شادی بھی ہو گئی۔ اے سچ کہیے کہاں ہوئی ؟ پھوپھی کی لڑکی سے۔

خدا مبارک کرے۔ لڑکی کیسی ہے ؟

چندے آفتاب چندے ماہتاب کا منی سی مورت۔ بوٹا سا قد نک سک سے درست کچھ سلیقہ کی بھی ہے ؟ کیوں نہیں سینا پرونا پکانا ریندھنا کیا نہیں آتا ماشاء اللہ پانچوں انگلیاں پانچ چراغ ہیں۔

میاں کا کیا حال ہے ؟ پروانہ ہے دیکھے جیتا ہے۔

جہیز کیا ملا ؟ ارے جہیز کی بھلی چلائی موئی بچھیا بھیس کے نام بھی گئے ٹوٹے پھوٹے دو چار ٹھیکرے بوری بوری کپڑے انھیں کے ہاتھ لگے دو چار تار چھیلے۔

چلو دو سر تو جڑ گئے۔ ہاں خدا رکھے گھر آباد ہو گیا میاں بیوی دونوں خوش ہیں۔ بس اور کیا چاہیے۔

خدا رکھے صاحب زادے کا کیا حال ہے ؟

بہن کیا بتاؤں خدا غوت دے ایسے لڑکے سے نہ ہونا اچھا۔

اے نوج۔ دور پار۔ چھائیں پھوئیں۔ شیطان کے کان بہرے انگریز بندوں کو۔ آپ کو وہم بھی نہیں آتا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ خدا رکھے ابھی سن ہی کیا ہے ؟ اے سن کیوں نہیں موا لونبڑ ہو گیا نہ لکھنے کا نہ پڑھنے کا سارا دن کنکوے پیچھے لقر لقر کرتا پھرتا ہے نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کی۔ سوکھ کے کانٹا ہو گیا آنکھیں ہیں کہ ڈھکر ڈھکر کر رہی ہیں دو نوالے اتارے اور بھاگا دو نوالے اتارے اور بھاگا کھائے گا دن بھر میں پانچ چھ دفعہ مگر وہی دو چار نوالے وہ بھی بیٹھ کے اہل دل نہیں۔ جاتا کہاں ہے، باہر تو میں نکلنے نہیں دیتی وہی بارہ دری کے سامنے والے احاطے میں دن بھر ادھم مچائے رہتا ہے۔

اکیلا ؟ نہیں اکیلا کیوں ہرمزی خانم کا لڑکا اچھے صاحب کا لڑکا اور محلے کے دو چار شہدے۔

خدا رکھے سن آئے پر سنبھل جائے گا بچپنا ایسا ہی ہوتا ہے شادی بیاہ ہو گا بیوی بچوں میں پھنس جائے گا پھر کہاں کا کنکوا کہاں کا وہ اے بہن آپ کی بھی باتیں یہ عادتیں کہیں چھٹتی ہیں بچپنے سے سنتی آ رہی ہوں۔ نواب آغن صاحب نے میں ان بڈھے کنکوا لڑ رہا ہے پوتا پوتی نواسا نواسی والے ہو گئے مگر کنکیا ہاتھ سے نہ چھوٹنا تھی نہ چھوٹی ایسے سب ایسے ٹھوڑی ہوتے ہیں اتنے بڑے شہر میں ایک نواب آغن صاحب ایسے نکل گئے تو کیا۔ ایک انہیں پر تھوڑی موقوف ہے ایسے نہیں معلوم کتنے آغن صاحب شہر میں

نوٹ:۔ خط کشیدہ فقرے عورتوں سے مخصوص ہیں باقی عورت مرد سب یکساں بولتے ہیں۔

[1] تکرار بار بار کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔

ہیں۔ آخر ان سے کنکیا لڑانے والے بھی تو ہوں گے۔

لکھنؤ کی ادبی زبان دوسری زبان باہر کی ہے یہ ذکاوت و ذہانت ادبیت اور قابلیت کے اظہار کی زبان ہے اس میں عربی۔ فارسی لفظیں تشبیہیں استعارے اور صنائع و بدائع ہیں ناسخ نے اس زبان کو شعر میں اس خوبی سے استعمال

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کیا کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے ؎

تماشائے بخون غلطیدن بسمل پسند آیا

یا

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات

کی طرح فارسیت نہیں پیدا ہونے پائی بلکہ اردوئے معلی بن گیا ؎

یہ سماعدون کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم
نیام تیغ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

ناسخ کے اس شعر میں ان کے اور شعروں کی بہ نسبت عربی فارسی لفظیں اور ترکیبیں زیادہ ہیں۔ یہ شعر خاص طور پر اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں کی افراط کے بعد بھی ناسخ کے شعر سے فارسیت نہیں ٹپکتی بلکہ نہایت فصیح اردو معلوم ہوتا ہے اسی کو ٹکسالی زبان کہتے ہیں۔ لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھتے وہ اسے مستند زبان کے معنی میں بولتے ہیں۔

ٹکسالی زبان کے معنی دنیا کی کسی زبان میں مستند زبان کو ٹکسالی نہیں کہا جاتا۔ ٹکسال میں سکے ڈھلتے ہیں زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہ صرف اردو میں ناسخ کی زبان کے لئے کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محلہ ٹکسال میں وہ رہتے تھے ان کی زبان میں جو شعر کہتا تھا اس کی تعریف میں کہا جاتا تھا کہ یہ ٹکسالی زبان ہے یعنی ناسخ کی زبان ہے باہر والوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا وہ اسے مستند زبان کے معنوں میں بولنے لگے۔

شاعری میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ بھونڈے بازاری اور اوباشانہ مضامین اور انداز بیان کو ترک کرکے تہذیب و شائستگی پیدا کی۔

۲۔ ہر طرح کے اخلاقی تمدنی اور فلسفیانہ مضامین غزل میں داخل کیے۔

۳۔ صنائع بدائع تشبیہ و استعارے ایہام و اشاریت سے نئی راہیں کھولیں۔

۴۔ ادائے مطلب کے سیکڑوں طریقے بتائے ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا ٭ روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

معجزہ شاعرانہ ہے شعرا نے اس زمین میں غزلیں کہیں مرثیہ گویوں نے سلام کہے۔ میر انیس ایسے خدائے سخن نے سلام کہا اور پوری قوت سے کہا مگر اس کا جواب نہ کہہ سکے اس کی ساری خوبی ادائے مطلب میں ندرت سے ہے۔

شدت جنون سے برہنگی کی حالت کس طرح بیان کرتے ہیں ؎

پوچھتا اشک اگر گوشۂ داماں تا ٭ چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

عالم بیخودی

دل کو خوش آئی میں صحرا کی بولیں پر خار ہو اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

دنیا میں مجھ سے زیادہ گناہگار کوئی نہیں۔ ؎

نجات ہو گی عذاب حساب سے سب کو ٭ جو پہلے روز قیامت مرا حساب ہوا

مفلسی کی وجہ سے کوئی پرسان حال نہیں۔

سد راہ کس و ناکس ہے مرا شہرۂ فقر ٭ ورنہ کب مجھ کو میسر کوئی درباں ہوتا

ترک دنیا میں آسودگی ہے ؎

کھلے دروازے ہر شب چین سے سوتے ہیں ہم جیب سے!

دیا ہے خانہ ویرانی کو عہدہ پاسبانی کا !!

اسی مضمون کو دوسری طرح یوں کہا ہے ؎

بادشاہی کر رہے ہیں اثر دالے فقر میں ❊ بخت خفتہ کو کہیں اطالع بیدار ہم

معشوق کے باغ میں جانے سے گلوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور باغ بے رونق ہو گیا۔ اس مضمون میں ناسخ کا اہتمام اور جدت دیکھئے وہ کہتے ہیں کہ باغ کی ساری رونق اس وجہ سے ہے کہ تو اپنی نزاکت سے باغ میں نہیں جاتا اگر تو اپنی نزاکت سے باغ میں جانے کی اجازت مانگے تو روئے گل سے رنگ اڑنے کی اجازت طلب کرے۔ ؎

تو نزاکت سے گلستاں کی جو رخصت مانگتا ❊ رنگ روئے گل سے اڑنے کی اجازت مانگتا

گلوں کی پردہ دری کیا ہوئی تمہیں منظور ❊ جو آج سیر گلستاں کو بے نقاب چلے

رفتار ناز کا اثر دیکھئے۔

آستین تن سے بہتر ہوگی کیا کوئی چراغ جاں پہ ❊ کیا گیا وان روش ناز سے ٹھوکر دامن

قناعت کا فائدہ کس طرح بیان کیا ہے۔

فاقہ مستی پہ قناعت ہو جو تمکو میکشو ❊ ہے لبالب بادۂ عشرت خم افلاک میں

اپنی عاشق مزاجی کس انداز سے بیان کی ہے ؎

تو نے شہباز نظر کو جو ادھر چھوڑ دیا ❊ ہم نے بھی طائر دل باندھ کے پر چھوڑ دیا

معشوق کے چہرہ کے سامنے چاند سورج ماند پڑ جاتے ہیں اس کو کس طرح کہا ہے۔

جلوہ رخسار تاباں سے وہ رشک مہر ماہ ❊ چاند سورج کو بنا دیتا ہے تارا چاند کو

عشق میں جان نہیں بچتی اس مضمون میں ناسخ کی جدت دیکھئے۔

تنگ ہوں زیست سے ہو جاؤں کسی پر عاشق ❊ کوئی اور اس کے سوا مرنے کی تدبیر نہیں

دنیا کی ہر چیز بے ثبات و ناپائیدار ہے اس مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے ؎

عیاں ہے ہر حباب بحر سے کیفیت دنیا ❊ برائے چشم بینا ہیں ہزاروں جام جم پیدا

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے ایک دفعہ ناسخ کا یہ مطلع پڑھا ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا ❊ طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اور کہا کتنا سجا ہوا مطلع ہے مگر ہمارے دل پر کیا اثر کرتا ہے؟

میں نے کہا اگر اس سے ان کے شاعرانہ کمال سے انکار ہے تو مجھے اختلاف ہے۔ جب پہلے پہل یہ مطلع میں نے سنا تو مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اس سے پہلے کسی نے اس مضمون کو اس طرح ادا نہیں کیا جس اہتمام سے انہوں نے کہا ہے ادائے مطلب کے ان اسلوبوں سے اردو پہلی مرتبہ ناسخ کی بدولت واقف ہوئی انھوں نے نئے اسلوب کی راہیں کھولیں تشبیہ و استعارے کے استعمال کے نئے نئے طریقے بتائے زبان میں ادائے مطلب کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں۔

ناسخ سے پہلے اردو میں غالب و اقبال کہاں تھے یہ سب ناسخ ہی خوشہ چیں ہیں وہ کون سا اسلوب اور مضمون ہے جو غالب نے ناسخ سے نہیں لیا۔ مرزا صاحب مسکرا گئے چپ ہو رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ ہی نے زبان کو اس قابل بنایا کہ اسمیں ادائے مطلب کی صلاحیت پیدا ہوئی ایک ہی بات کو سیکڑوں طرح سے کہا ہے ایک شب ہجر کے مضمون کے ہر شعر میں انداز بیان کی ندرت دیکھئے۔

طول شب فراق کے شکوے سے فائدہ ❊ ہم جان بلب ہیں ہم کو امید سحر کہاں

شب فرقت میں شمع کا کیا ذکر ❊ زندگی کا چراغ بجھ گیا ہے

وہ کہہ گئے تھے کہ آئینگے ہم چراغ جلے ❊ تمام رات چراغوں سے دل کے داغ جلے

روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا ہجر خلق
صبح میری شام غم کو آسماں کرتا نہیں

شب فراق نہ دیکھی نہ ہیں نے دن سیاہ
کبھی نہ ہوش تمہارے فراق میں آیا

آفتاب حشر بھی تارا ہے اس کی شام کا
گردش ایام میں صبح شب ہجراں نہیں

ہے یہاں کسکو شب فرقت میں ہوش
ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں!
ہجر کی شب مجھے ہے بیزار صبح

وصل کی شب ہو چکی اندھیر ہے
شام سے دکھلاتی ہے آزاد صبح

وصل میں غائب تو حاضر ہجر میں
دیتی ہے ہر شب نیا آزار صبح

توقع ہے شب فرقت میں مجکو صبح ہو نجی
معاذ اللہ کتنا موت سے انسان غافل ہے

رات ایسا انتظار یار میں بیتاب تھا
بستر گل نہ تھا میں آگ پر سیماب تھا

رات مجکو ترے آنے سے جو مایوسی ہوئی
انتظار مرگ تھا یا اشتیاق خواب تھا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں
سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

ہے شب ہجر تا ابد نہیں صبح
نہ رہا خوف روز محشر کا

صنعتوں کا استعمال صنعتوں کے استعمال سے وہ شعر میں جس طرح لفظی و معنوی حسن پیدا کرتے ہیں اس کی تعریف نہیں ہو سکتی ؎

کشتی اس کی نہ ڈوبے صورت موج
جو کہ طوفان کو ناخدا سمجھے!

کتنا بلند خیال ہے اس کو کتنی روانی اور فصاحت سے پیش کیا ہے اور کشتی۔ موج۔ طوفان۔ ناخدا سب جمع کر دیا ہے ؎

سیر خشکی و تری گھر میں میسر ہو جائے
دل اگر آئینہ ہو جائے سکندر ہو جائے

وحشیو کہتی ہے زنجیر باواز بلند
بستہ عقل جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار دیتا جا

کس قدر بلند مضامین ہیں ان کو کس روانی بہ جستگی صنائع و بدائع اور طرز

ادا کی ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے اور سنئے ؎

اے اجل تو نے بار جسم سے اگر نجات
کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا انبار تھا

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو سمجھے آگ ہے

نکتہ آفرینی ملاحظہ کیجئے ؎

ہمارے کیف کو کچھ خوف احتساب نہیں
خیال چشم ہے یاں ساغر شراب نہیں

جانب رحمت حق دیکھتا ہے ہر ندامت کا
شاد ہو جاتے ہیں کیا دیکھ کے میخوار گھٹا

جیتا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں
مدت ہوئی کہ مر چکے ہیں ہم حساب سے

محذوفات سے ندرت ان کا ایک خاص اسلوب الفاظ و فقرات کے حذف سے بیان میں ندرت پیدا کرتا ہے ؎

ہر ایک کی صدا لئے قدم دوڑتی ہے دل
بہتر ہے مجکو یاس ترے انتظار سے

وہ بدگمان سمجھتا ہے چاند کا مشتاق
کبھی جو ہم سوئے گردوں نگاہ کرتے ہیں

فصل گل میں پیا زور ایام توبہ ہے مدام
عمر بھر اے میکشو باب اجابت باز ہے

آتا ہے رشک اے دل پر آبلہ تجھے
کیا جلد پھوٹتا ہے پھپھولا حباب کا

اشاریت اشاریت کے معنی ہیں ایک نازک کنایہ سے ذہن کا معنی کی طرف منتقل ہونا۔ ادائے مطلب کی اس ندرت سے لطف معنی بڑھ جاتا ہے اور یہ شاعری کا بڑا نازک مرحلہ ہے ناسخ نے اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی ؎

نور مہتاب ہے دھوئیں کی مثال
ہائے کیا آج رات کالی ہے!

خلل پذیر ہمیشہ ہے کار خانہ عقل
کبھی نہ خانہ زنجیریاں خراب ہوا

ابہام کسی بات کا واضح طور پر نہ کہنا ابہام ہے شاعری میں ابہام اسی وقت لطف پیدا کرتا ہے جب وہ سیکڑوں وضاحتیں اپنے دامن میں لئے ہو نہیں تو مہمل ہے ناسخ نے

اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال اُردو میں کوئی نہیں ؎

دل اس بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے   خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

حیات و کائنات کے مسائل | زندگی کی تلخ حقیقتیں کس شاعرانہ انداز میں پیش کی ہیں ؎

عالم ہے محو آئینہ خانہ کی سیر میں   اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں!

تمام صفحہ عالم ہے ایک ہی صفحہ   سرِ کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

موسم گل کر گیا پرواز باغِ دہر سے   یاں ابھی تنکے ہیں بہرِ آشیاں منتقل ہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب   یاں اعتبار دوستیِ جسم و جاں نہیں

ہمصفیرو دیکھنا قسمت چلی آئی ٹھہرا   اُڑ کے گلشن کو جو بعد ذبح اپنے پر چلے

ہم میکدے میں آئے تو خالی تھے نظر بیٹھے   رہتے تھے خم شراب کے اور بھرے ہوئے

ذکرِ پرواز تو کیا تنگ ہے اتنا یہ چمن   جھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہپر اپنا

روزمرہ اور سادگی دیکھیے

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں   دل نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

وصل میں بھی تھے کہ جس دل کو نہ آتا تھا قرار   اے فلک تو نے کیا اس کو گرفتارِ فراق

تجھ سے انصاف تو کر چھٹ نہ سکا ایک عجیب   میں نے کیونکر تری الفت میں زمانہ چھوڑا

ہو نہ وہ ہم دوست کر سکتے ہی دل اپنا گھٹتا   غم عالم کی اگر دل میں سمائی ہوتی

صحنِ گلشن میں جو اس گل کی سواری آئی   سمجھے مرغانِ چمن بادِ بہاری آئی

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے من گئے   بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے

فراقِ یار میں فصلِ بہار آئی ہے   الٰہی آتشِ گل سے تمام باغ جلے

تمثیل | ان کی بڑی خصوصیت تمثیل ہے جس میں انہوں نے غالب کو بھی پیچھے ہٹا دیا اور ایسی نادر تمثیلیں پیدا کیں جن کا مثل اُردو میں نہ تھا ؎

عشق سے کس کے دل کو لاگ نہیں   کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو   صدمہ شیشہ کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

رہتا ہے کہاں ساتھ برے وقت میں کوئی   پتھر کو لگی چوٹ شرارے نکل آئے

آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک   اُڑتا پھرا شجر سے جو برگِ خزاں گرا

شوخی | ان میں سنجیدہ ظرافت اور شیریں شوخی بھی تھی جو خاص لطف پیدا کر دیتی تھی ؎

خبر کرے کوئی زاہد کو آئے بہرِ خدا   شکستِ توبہ کو پھر موسمِ بہار آیا

کعبہ میں جا کے بیٹھ رہوں گا میں دیکھنا   تو دیر سے نکالے گا اے بت اگر مجھے

مے پرستو آؤ کر لو محتسب کو سنگسار   بچ رہے ہیں سنگ کچھ میخانے کی تعمیر سے

توڑی واعظ نے اگر گردنِ مینا ناحق   مے پرستوں نے بھی مسجد کا منارہ توڑا

صبحدم جب صحنِ مسجد میں اذاں ہونے لگی   ہم نے بھی میخانے کے دروازہ پر آواز دی

جو ہم فنا ہوں تو لازم ہے اے نظرباز   ہمیں بھی یاد کرو جب کوئی حسین دیکھو!

تصوف | ان کے یہاں تصوف بھی ہے مگر وہ تصوف نہیں جو سمجھ میں نہ آئے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے مسلک شاعری کی مطابق بہت صاف اور واضح ہے ؎

سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا   جس کی خواہش تھی وہی ہر سو نظر آیا مجھے

تو کسی سے نہیں ہے بیگانہ   پر کوئی آشنا نہیں تجھ سے

کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے   نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے   تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

تغزل | غزل کا تیکھا پن ملاحظہ ہو ؎

بھول کر او چاند کے ٹکڑے اِدھر آ جا کبھی   تو میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

تری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت   ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

گیا وہ چھوڑ کر رستہ میں مجھ کو   اب اس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں   ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

دل ہی اس کا جانتا ہے جس پہ گذرا ہے یہ حال — عشق کا صدمہ زبانوں سے کہا جاتا نہیں

آسماں پر دل فرشتوں کے بچھے جاتے ہیں آج — یہ زمیں پر پاؤں رکھنے کا نیا انداز ہے

چلنے سے عمر رواں اپنی ٹھہر جاتی ہے — جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے

سو رمز کی کرتا ہے اشارات سے باتیں — ہے لطف تکلم سے خموشی میں زیادہ

سو رقص سے افزوں ہے پری رو تری رفتار — پاؤں کی صدا لاکھ ترنم سے زیادہ

پوچھ اے ناصح نہ کچھ میری اداسی کا سبب — اب میں خود دن رات حیراں ہوں ہوا ہے کیا مجھے

بیٹھ جاتا ہوں جگر تھام کے میں دیوانہ — وہ پری رو مری محفل سے جہاں اٹھتا ہے

دل کو تھامے ہوئے بیٹھے ہیں یا جو ہم فرقت میں — ہم نشیں آج بہت دردِ نہاں اٹھتا ہے

دل دوڑتا ہے کوچۂ دلدار کی طرف — جب سے نہیں ہے طاقتِ رفتار پاؤں میں

زبان کی یہ صفائی، بیان کی یہ سنجیدگی مضامین کا یہ تنوع طرز ادا کی یہ جدتیں مضمون کی یہ خلاقی۔ تمثیلات کی یہ شان صنعتوں کا یہ حسن استعمال نہ میر کو نصیب تھا نہ سودا کو یہ اردو میں بالکل نئی چیزیں تھیں۔ انھیں کو دیکھ کے مصحفی مقلد ہوئے غالب کو ان کی نشتریت محسوس ہوئی نقادان سخن نے میر و سودا کے کلام سے مقابلہ کر کے فیصلہ کیا کہ ناسخ نے اس پر خط نسخ کھینچ دیا اور "در ریختہ طرح نوی ریختہ"

بعد کے شعرا نے اس طرح نوی کی پیروی کی غالب نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہم نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا ان کے بہترین اشعار وہی ہیں جن میں وہ ناسخ کی زبان و شاعری کے تتبع میں کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا — غالب

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا 〃

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا 〃

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا — غالب

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا 〃

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا 〃

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا 〃

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں 〃

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا — مومن

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا — میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا 〃

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا 〃

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا 〃

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں 〃

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو 〃

برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو 〃

اک لحظہ نہیں قرار جی کو — موت آئے بس ایسی زندگی کو 〃

کوئی نہ رہا جو پوچھے آ کر — کیا روؤں میں اپنی بے کسی کو 〃

معلوم ہوا کہ ناسخ نے زبان و شاعری میں جو انقلاب پیدا کیا اس کو لوگوں نے زبان کے اعلیٰ معیار فصاحت و بلاغت پر پہنچنے اور شاعری میں ادائے مطلب کی جدتوں تشبیہ و استعارہ کی ندرتوں مضامین کی وسعتوں خیالات کی بلندی تہذیب و شائستگی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے پسند کیا ان سب کی تفصیل آپ سن چکے۔ مصحفی، غالب اور سعادت ناصر خاں نے ایک بات اور کہی ہے کہ وہ پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔ اس پرانی ناہموار روش کو جب تک آپ نہ دیکھیں گے لکھنؤ یا ناسخ کی ہموار روش کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناہموار روش مضمون آبرو، میر و سودا سے مصحفی و انشا، جرأت، رنگین تک باقی رہی اس لئے ناسخ سے پہلے کے تمام ادوار کا کلام دیکھئے۔

اُردو شاعری کا ابتدائی دور

آبرو ۔ یکرنگ ۔ مضموں ۔ ناجی ۔ حاتم ۔ آرزو ۔ فغاں ۔ مظہر

مجھے درد و الم گھیرے ہے نت میرے میاں جیسا تھا ۔ خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں جیسا تھا ۔ آبرو

اندازسے زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں ۔ جو خال اپنی حد سے بڑھا سو مسا ہوا ،،

دل یوں ڈرے ہے زلف کا مارا سیہ رنگ سیں ۔ رسی سے اژدھا کا ڈرے تو نہ ڈسا ہوا ،،

مسی کے چرچا غیر سے جا کر چھپو نہ دیر چھوڑ دی ۔ گھر چلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا ،،

ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے ! ۔ یہی غنچے کے دل کی گھڑی ہے ! ،،

چھپ کر تو لعلوں سے اس طرح آپ لنگ کیے ۔ کوئی سنے زیبا ہے تیرے قدم کا کھٹکا ،،

کہتے ہیں ہم پکار مسلمان دھرم سجن ۔ گر غیر سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں ۔ یکرنگ

یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط ۔ رکھتا ہوں میں دو نین کہو تو نذر کر دوں ،،

انگوٹھی لعل کی گھر تی قیامت آج گر ہوتی ۔ جنھوں کی ان پنچی لڑتی ہوئے وہ ایک تجلی ۔ مضموں

نہ تو کو یاد کو کہ خط رکھتا یا منڈاتا ہے ۔ مرے فشہ کی خاطر لطف سے سبزی بنا ہے ،،

لیا اس گلبدن کا ہم نے بوسہ ! ۔ تو کیا جو مار رقیبوں نے بھگا دیا ۔ حاتم

کئی عالم کئے ہیں قتل ان نے ۔ کرے کیا ایکلا حاتم بچارا ،،

دریائے اشک اپنا جب سر پہ موج مارے ۔ طوفان نوح بیٹھا گوشے میں موج مارے ۔ آرزو

ہر شوخ خرابات کی کیفیت نہ کچھ پوچھو ! ۔ بہار حسن کو دی آگ اس نے جب چمن میں تھا ،،

منت سودا ہے اُسے یار کہاں جاتا ہے ۔ آمرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے ۔ فغاں

کہا پیچ و تاب اب وہ ڈسیں مجھ کو کہ لیا ۔ ظالم اسی لئے میں نے زلفیں تیری پالیاں ،،

نہیں آتا اسے تکیہ پہ آرام ۔ یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے ۔ مظہر

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا ۔ ڈبو لیا ہائے آنکھوں نے مشرہ کا تماشا ،،

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر ۔ فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

اُردو شاعری کا عہدِ زریں

میرؔ ۔ سوداؔ ۔ دردؔ ۔ سوزؔ

یہ اُردو شاعری کا تدریجی دَور کہا جاتا ہے اس لئے ہم اسے تفصیل سے پیش کرینگے

تغزل

کہتے ہیں لوگ یار کا ابرو پھڑک گیا ۔ تیغا سا کچھ نظر میں ہماری سٹرک گیا ۔ سودا

ماہ نو تجھ یاد ابرو میں ہے سینہ کا خراش ۔ کس یسوع سے ہے کم یہ ہر ہیجے کا خراش ،،

لے جسد سے گیا ہو کر خفا وہ تند خو ۔ غنچۂ دل کی کھلی پھر بھی نہ کلیاں دیکھیاں ،،

دشنام دیجئے وہ جدھر کا کھینچا ۔ چبھتی ہے میرؔ دل میں وہی آن بان آن ،،

مژہ اس چشم کا کھٹکے ہے دل محزوں میں ۔ نشتر میرے لہو کی پڑی جیبوں میں ،،

کیونکر نہ چشم و ابرو سے ہو قتل دل مرا ۔ دو ترک مست لگے جو تیغا پلا کریں ،،

خون جگر کا کھاتا دل پر نہیں گوارا ۔ اس ترش ابرو کی جبیں نہ ہوئے چیں چینی ،،

آہ کس طرح تری راہ میں ٹھیرو کہ کوئی ۔ سدہ ہو نہ سکا عمر چلی جاتی کا ،،

اس کنج لب پہ چپکے ہوئے منہ کو رکھ کے ہم ۔ دلچسپ اس مقطع پہ حرف و کلام کیا ،،

دل پہنچا بلا کی کو نپٹ کھینچ کسالا ۔ لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ میر

مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر ۔ عشرت بھی بلا ان کو نہ سکار دیا کر ،،

میرے سنگ مزار پر فرہاد ! ۔ رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد ،،

ہم وحشیوں سے مدت مانوس جو رہے ہیں ۔ مجنوں کو شوخ لڑکے کہنے لگے ہیں کا کا ،،

طاقت نہیں ہے دل میں نے دل بچا رہا ہے ۔ کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے ،،

سلو ان دنوں ہم سے اک رات جاتی ۔ کہاں ہم کہاں تم کہاں زندگانی ،،

ہوا جاتی رہی وعدہ ہی تو شکستگی کی ۔ جواب بھی سوز ہو مل کر تو جائز دل کا سودا

مصحفی و انشا کا دور

اس دور میں زبان کچھ صاف ہوئی مگر مضمون کا بھونڈا پن بیہودگی ابتذال باقی رہا بلکہ غزل سے چوما چاٹی تک کی نوبت آ گئی ردیف قافیہ کی ناہمواری اور بڑھ گئی انشا رنگین کے دیوان سے صرف ردیف الف کے کچھ ردیف و قافیے دیکھئے

بچھایا بسترا ۔ بنگایا بسترا
بنارے غش کیا ۔ قرار نے غش کیا
جیٹ سے غش کیا ۔ غٹ سے غش کیا
ننگ میں کیڑا ۔ رنگ میں کیڑا
تھنوں کی ہوا ۔ بختوں کی ہوا
چراغ ٹھنڈا ۔ دماغ ٹھنڈا
سیماب کا گٹکا ۔ بیتاب کا گٹکا
تلفل کا منہ چڑھایا ۔ بلبل کا منہ چڑھایا
ہر آن یہ گالی دینا ۔ نقصان یہ گالی دینا
ادھیڑے جا ۔ تھپیڑے جا

دس پانچ غزلیں ایسی ملیں گی جنکی ردیف و قافیے مناسب ہوں پورا دیوان اسی طرح کی ردیف و قافیوں سے بھرا پڑا ہے ان میں کوئی اچھا شعر کہنا ممکن ہی نہیں۔
مضمون اور انداز بیان کا بھونڈا پن اور ابتذال دیکھئے ؎

منظور ایک بات اگر ہو تو آیئے ؛
گلشن میں اک کنارے ہے چینا چھا خوب

کب چاہوں ہوں میں صرف ملاقات کی ٹھہرے
جب خوش ہو مرا دل کہ جب اس باغ کی بہار

بھلا آپ گھر جائے کس واسطے ؛
کبوتر کا باہم جو جوڑا لگا

اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا
کوئی رنگین بیٹھی تیرے کوچہ میں یاں بیٹھا ہے

کچھ تو اک تاؤ سا کھا چین بجبیں ہو کے دیا
گالی دیکر یہ کہا ان نے کہ ہاں رہتا ہے

جب میں نے کہا کہ مجھ کو تم سے !
ملنے کا ہے اشتیاق بے حد

یکبار وہ کھلکھلا کے رنگین !
بولے کہ چہ خوش چرا نباشد

یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ
ہچکیے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آ جائیگا

یار کا وہ پر نکلنا اس دل بیتاب سے
کوئی گر جھوٹوں کہے گا تو یہ رہ جائیگا

مت یہ گھبرا کر کہو اب گھر کو بندہ جائیگا
کوئی مرجائیگا صاحب آپ کا کیا جائیگا

ڈوبے یوں بحر محبت میں کہ اب جیتے جی
اپنا دشوار ہے اوپر کو اچھل کر آنا

ورنہ دل کہنا مرا شاید کہ اس نے سن لیا
ورنہ کیوں مجھ کو دھرا تا ہے بھلا چلا گیا

کل جو ننھے پہ میرے ٹک دھیان اس نے کیا
ہنس کے یوں کہنے لگا گیا آنکھ میں کچھ پڑ گیا

جان بلبل سن کسی سے وہ مجھے یوں بولا
میری بیزار سے مجنے دو پڑا مجھ کو کیا

شب گھر جو رہا میرے وہ مہمان ؛
تھا صبح یہ کس ادا سے کہتا ؛

طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے
قربان گیا یہاں کا رہنا ؛

شب کیا وہ چپکے چپکے وہ شوخ و شنگ بولا
دیکھو نہ ہم رہیں گے گر پھر پلنگ بولا

تجھی سے ہم کو کہتا کہ چل بے والی تو ہو جا
معلم اس کو حق روز [illegible]

اپنے کوچہ میں مجھے دیکھا تو یہ کہنے لگا
تو جہاں رہتا ہے جرات تیرے گھر کو کیا ہوا

جب میں نے کہا ادب بد نام ہوئے آ
تب کہنے لگا چل بے او بدنام پرے جا

میں نے جو کہا ایک تو بوسہ مجھے دیدے
بولا کہ زباں اپنی کو تو تھام اے !

ہوں گے دم میں تہ و بالا کونین
آپ نتھنوں کو نہ پھڑکائیے گا

پیچھے پیچھے مرے چلنے سے رکو مت صاحب
کوئی پوچھے تو یہ کہیو کہ مرا نوکر ہے

ایسے سینکڑوں اشعار ان کے یہاں سے اور پیش کئے جا سکتے ہیں اس وقت شاعری یہی تھی اس کے یہ معنی نہیں کہ صاف اور سنجیدہ شعر بالکل نہیں ہیں مطلب یہ ہے کہ ایسے شعر بھی کہتے تھے ان کو شاعری سمجھتے تھے اور اپنے دیوان میں داخل کرتے تھے اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی شاعری میں زبان کی صحت روانی و سلاست فصاحت و بلاغت ہے۔ گنواری اور بازاری الفاظ نہیں ہیں ادائے مطلب میں جدت تشبیہ و استعارہ کی

؎ اسی مضمون کا ناسخ کا شعر ہے ؎
ہو گیا قرآن کا پڑھنا غضب ۔ درد اسکو لن ترانی ہو گیا

کی ندرتیں ہیں اور یہ خوبیاں رفتہ رفتہ نہیں بلکہ ایکا ایکی انقلابی صورت میں پیدا ہو گئیں اور یہ ناسخ کا بڑا کارنامہ ہے مولانا امداد امام اثر نے سچ کہا ہے کہ اگر ناسخ نہ ہوتے تو اردو زبان و شاعری آج اتنی شائستہ نہ ہوتی۔ یہ فرق ناسخ اور ان سے پہلے کی شاعری کے موازنہ سے واضح ہو جائیگا مگر میر و سودا کے بہت سے مضمون کا ناسخ کے یہاں وجود نہیں جیسے

قدم کے چھونے سے استادگی مجھے سی ہوئی — کبھی وہ یوں تو مرے ہاتھ بھی لگا ہوتا — میر

شوخی تو دیکھو اپنی کہا آؤ بیٹھو میر — پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زبان پر — ״

کیسا اب زہد و تقویٰ وارو ہے اور ہم ہیں — بنت العنب کی اپنا کچھ گیا گھر کر — ״

لا پوچھ کچھ لب ترسا بچہ کی کیفیت — کہوں تو دختر رز کی فلاں جل جائے — ״

اثبات کرکے تم سے اک بات اب کہوں سن — لیکن نہ کہنے لگیو مجھ پہ یہ جو سنا ہے — سودا

سرین میں اتنی جھلکی لی بذکر جام زاہد نے — کہ جتنا شیخ کو مذکور انگلانا ہے شیشہ کا — ״

یہ شیخ وہ رشتہ ہے زنار ہمارا جس نے — پھاڑ ڈالی تیری تسبیح کے ہر دانے کی — ״

شیخ کو ذوق اچھلنے سے نہیں محفل میں — اس بہکنے سے مٹاتا ہے وہ اپنی چل کو — ״

لے گھسے حجرہ میں خادم کو کہ ہم جا پہنچے — شیخ صاحب سے کرامات نہ ہونے پائی — ״

عزلت محل شیخ کہ تیرنے لئے تیار — کوئی ہفتہ گزرے شیخ کو کوئی وہ دیجئے — ״

ایسے مضامین ناسخ کے یہاں نہیں موازنہ کے لئے ایک موضوع کے اشعار دیکھئے۔

کلام ناسخ!

تغزل

چلائیں ٹھوکریں صور بد مست کھاتا — وہ یوں چلے کہ کوئی ساغر شراب چلے

خرام ناز تو اس کوچہ گرد کا دیکھو — نہ اس طرح کبھی صحن چمن میں آب چلے

دوڑتے ہیں دیکھنے والوں کے دل بے اختیار — ہے غضب انداز او ظالم تری رفتار کا

بیٹھنے سے تیرے چال اپنی ٹھہر جاتی ہے — جب ترا جلوہ رفتار نظر آتا ہے

وہ چشم فتاں ہے غیرت غزال وہ زلف پیچاں ہے رشک سنبل — عذار میں ہے شباہت گل بدن میں عالم ہے یاسمن کا

خاطر ان کو کر دیتے ہیں بسمل کیونکر — تیر رکھتے ہیں نہ پروا نہ کمان رکھتے ہیں

لباس و سامان آرائش

منہ دیکھیں آفتاب پرست آفتاب کا — سرکا دے اپنے چہرہ سے گوشہ نقاب کا

رات گھٹتی ہے تو بڑھتا ہے فروغ آفتاب — حسن رخ چمکا جو اس نے زلف کو کم دیا

کرتے ترے مسی آلودہ ہونٹوں کی ثناخوانی — خدا نے اس لئے اتنی زبانیں دی ہیں سوسن کو

بالے موتی کے ہیں تارے لئے تابان آفتاب — تیرے آنے سے ابھی بام آسماں ہو جائیگا

بندہ بالی میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں — وہ ستارہ صبح کا ہے یہ ستارہ شام کا

سرخ پوشاک پہن کر وہ سہی قد جو گیا — جل اٹھے سرو چمن مثل چنار آپ سے آپ

ناز و نیاز

یاسمن دھوپ سے ہوئے گل تر — دیکھو آئینہ میں عذار اپنا !

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی — دل ہی دل میں تمھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

اب تو جی کھول کے دن رات کرو ظلم و ستم — ناتوانی سے مجھے طاقت فریاد نہیں

کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر — بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا

آئینہ دل میں ہے ترا عکس — دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

خمریات

پیشتر نشۂ ایجاد سے مدہوش ہوں میں — خم گردوں بھی نہ تھا جب سے کہ مے نوش ہوں میں

کرتے تھے فاش نشۂ مے بد مست سر غیب — اس واسطے حرام کیا ہے شراب کو

حاجت نہیں نماز کی مستی میں زاہدا — کیا مرتبہ خدا نے دیا ہے شراب کو

لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے — فصل وداع ہوش ہے موسم نائے و نوش ہے

حشر تک جی میں ہے بے ہوش رہوں اے ساقی — کاش مجھے بھر دے مری عمر کے پیمانے میں

حیات و کائنات کے مسائل

ہر کسی کام رکھتا ہے دو دور آسماں — گر ہم ہیں پا سر شوریدہ تو پتھر نہیں

رنگ عشرت باغ عالم میں نظر آتا نہیں — گل کو گل چیں کا خطر بلبل کو ڈر صیاد کا

دو روزہ ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں — وہ کون سا چمن ہے کہ جس میں خزاں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا — باغ جہاں میں فصل بہار و خزاں نہیں

جدت ادا

اے پری مکھڑا دکھلا ہے کیا ہی پیارا چاند کو — رات میں نے تیرے دھوکے میں پکارا چاند کو

اس کی ہر دم کی نصیحت سے میں تنگ آیا ہوں — کاش صبح سے بھی آنکھ اس نے لڑائی ہوتی

تعبیر ہے کہ یار کی پڑ جائے گی نگاہ — بجلی گری رات کو کل مجھ پہ خواب میں

بے خودی میں یہ کون یاد آیا! — خود بخود دل ہے بے قرار اپنا!

ہجر و فراق

میں نے یہ جانا کہ میری طرح ہے فرقت نصیب — آنکھ میں جس کی نظر آیا کوئی آنسو مجھے

مرگ اک سوتی تھی ورنہ یہ گراں خواب کو — کہ جہاں کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

ناسخ غم فرقت میں یہ ہے حال ہمارا — جب کھینچتے ہیں آہ تو آتا ہے جگر ساتھ

پاس ہے نظارۂ رخسار آتشناک سے — آگ لگ اٹھی ہے دل میں شعلۂ ادراک سے

صنعتوں کا حسنِ استعمال

جس قدر ہم سے تم ہوئے نزدیک — اس قدر دور کر دیا ہم کو!

رہے وہ گل چمنستان دہر میں شاداب — دکھا کے سرو سا قامت کیا نہال مجھے

وحشیو کہتی ہے زنجیر باواز بلند — پستہ عقل ہے جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

زاہد و واعظ

نہ پائیں زاہد بے آبرو شراب کہیں — نہ اپنے ساتھ کہیں کھوئیں آبروئے شراب

کسی نعمت سے ہیں واقف نہیں جز بادۂ تلخ — زاہدا اب تو سمجھ تارک لذات مجھے

عمر بھر دھڑکے عذاب حشر سے — زاہدا تیرا ہی دل گردہ ہے

حسن بھی کیا چیز ہے زاہد ذرا انصاف کر — اپنے بندوں کو خدا دیتا ہے لالچ حور کا

فراق یار میں تقریب ہے مجھ کو بادہ خواری سے — کہیں زاہد نہ کر دے متہم پرہیزگاری سے

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ وہ ناہموار روش زبان کی ناہمواری طرز بیان کی ہمواری مضامین کی ناہمواری لب و لہجہ کی ناہمواری تہذیب و شائستگی کی ناہمواری ہے اس وقت تک ناز حسن اور نیاز عشق کی حکایتوں ہجر و وصل کی کیفیتوں کے بیان کا سلیقہ نہ تھا بھونڈا پن ناشائستگی اوباشانہ لہجہ بیہودہ باتیں بھونڈی زبان اور بھدی ترکیبیں عام تھیں ناسخ نے اس طوفان بے تمیزی کو روکا اور شاعری کا رخ تہذیب و شائستگی حسن بیان لطف زبان اور طرز ادا کی ندرتوں کی طرف موڑ دیا اور ایک ایسا راستہ بنا دیا جس پر وہ آگے بڑھتی رہی۔

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا اسلوب

آتش کا طرز لکھنوی شاعری کا دوسرا اسلوب ہے

ناسخ نے زبان کی سلامت، روزمرہ کی تہذیب و شائستگی صنائع و بدائع تشبیہ و استعارہ کنایہ اور تمثیل مضمون آفرینی اور طرز ادا کی جدتوں سے شاعری میں جو فضا پیدا کر دی تھی اس سے نکلنا ممکن نہ تھا کیونکہ لطف زبان اور حسن بیان اسی پر منحصر تھا۔

آتش اس معاملہ میں غیر شعوری طور پر ناسخ کے متبع تھے لیکن ان کے یہاں ایک بات اور بھی ہے اور وہ عاشقانہ جذبات کا خلوص حسن و جمال کے تاثرات، والہانہ کیفیت ہے

آئینہ سامنے رکھتے تو غش آ جاتا — تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا
آنکھ اگر آئینہ سے تم نے لڑائی ہوتی — رات بھر میری طرح نیند نہ آئی ہوتی
چمک چمک کے نکلنے کا حال کھل جاتا — کسے دکھاؤں وہ رخ چشم مہر و ماہ نہیں
کسی صورت سے نہیں جان کو قرار اے آتش — تپش دل مجھے اچھالے لئے پھرتی ہے
رات بھر کیں دل بیتاب سے باتیں ہم نے — رنج فرقت کے گرفتار نے سونے نہ دیا
تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں — رہا ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبل ناشاد گفتگو کرتے
فراق یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گذری — جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بہتا [illegible]
شباب تک نہیں پہنچا ہے عالم طفلی — ہنوز حسن جوانی یار راہ میں ہے!
ہم سا حسین ہو یا نہ ہو کیونکر نہ اس کے پھر — ناز بجا و غمزہ بے جا اٹھائیے
کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا — کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

ذہنی شاعری | ناسخ کی شاعری ذہنی ہے اس میں ان کا دل شریک نہیں جن لوگوں کو مضمون آفرینی میں لطف آتا ہے ان کا ذہن موجد و فلسفی کے ذہن سے مماثلت رکھتا ہے ان میں حسن کی کرشمہ سازیوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت کم ہوتی ہے ایسے لوگ ناسخ کے دلدادہ ہیں۔

قلبی شاعری | تاثرات کا اظہار قلبی شاعری ہے ایسے شاعروں کا بھی ہر شعر ایسا نہیں ہوتا ان کے یہاں بھی ذہنی شاعری کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مگر ان کی قلبی کیفیت ان کی زبان اور لہجہ میں اثر اور کیف پیدا کر دیتی ہے جن لوگوں میں جمالیاتی احساس پیدا ہوتا ہے وہ آتش کے گرویدہ ہیں اور ذہنی شاعری کو پسند کرنے والے بھی اس میں ایک کیفیت محسوس کرتے ہیں کیونکہ بہرحال ان کا دل بھی عشق کی کشش سے یکسر خالی نہیں ہوتا مگر قلبی شاعری کے دلدادہ ذہنی شاعری سے محظوظ نہیں ہوتے کیونکہ وہ دماغ سے ادراک کے نہیں بلکہ دل سے محسوس کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کی اصلی شاعری | یہ دونوں رنگ ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ تک الگ الگ نظر آتے ہیں مگر ان کے بعد کے شعراء میں دونوں رنگ سموئے ہوئے ہیں کیونکہ تاثرات عشق سے تو کوئی دل خالی نہیں ہوتا کم زیادہ کا فرق ہے بعد کے شعراء نے قلب و دماغ دونوں سے کام لیا ہے اور یہی لکھنؤ کی اصلی شاعری ہے

ناسخ کی تحریک | ناسخ زبان مضمون لہجہ انداز بیان اور تہذیب و شائستگی کا ایک سیلاب اپنے ساتھ لائے جو تمام خس و خاشاک کو بہا لے گیا پھر بھی دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا۔ ردیف و قافیہ کا بھونڈا پن تو دور ہو گیا مگر مشکل ردیف و قافیہ رہ گئے میری جان۔ جانی۔ پستان اور ساق باقی رہ گئی ناسخ کا مصرع ہے

دیکھیں میں ساقی ساقی گلفام دوش پر

ان کے شاگردوں نے یہ ناہمواریاں کم کیں بہت سی لفظیں ترک کیں اور شائستگی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا مگر مشکل ردیف و قافیے اور دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا حسن و عشق کے بیان میں کبھی کبھی متانت و شائستگی کی حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

لکھنؤ کی شاعری کے دوسرے دور (جلال امیر مینائی) میں ردیف و قافیہ کی ناہمواری کم ہوئی تہذیب و شائستگی بڑھی پھر بھی ایسا مال رہ گیا جس کو الگ باندھ کے رکھا تھا اور اس سے تہذیب کی نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں۔

تیسرا دور جاوید عارف رشید مرزا رسوا اور نظم طباطبائی کا ہے اس میں زمینیں نہایت شگفتہ ہو گئیں ردیف قافیے کی ناہمواری دور ہو گئی اور شاعری پہلے سے زیادہ مہذب و شائستہ ...... ہو گئی پھر بھی تا میری جان - جانی منہ میں زبان ایسی باتیں باقی رہیں۔

چوتھا دور صفی عزیز محشر آرزو کا ہے اس میں زبان و شاعری کی تمام ناہمواریاں دور ہو گئیں زمینیں شگفتہ غزلیں مختصر اور شاعری مہذب ہو گئی۔ یہ دور دو سو برس کی شاعری کا جوہر اور ناسخ - آتش کی شاعری کی معراج ہے اس دور سے بہتر شعر اردو میں نہیں کہے گئے۔

پانچواں دور مرزا جعفر علی خاں اثر کا ہے جو ملک غزل کے تنہا فرمانروا تھے یہ شاعری کے خاتمہ کا دور ہے کیونکہ اس پایہ کے شاعر پھر نہیں پیدا ہوئے یہ ہے لکھنؤ کی شاعری کا مختصر جائزہ۔ اس میں ہر دور کے شعراء کا کلام تمام شعرائے ہندوستان کے لئے مشعل راہ رہا ہے اور آج بھی ہے جدید شاعری کے علمبردار اگر اس کا بغور مطالعہ کریں تو ان کو اپنے اشعار کے نقائص کا ... اور شاعری کا فن معلوم ہو سکتا ہے۔

--:--

لکھنؤ کی شاعری

کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر پایہ اس زمین کا

دور اول

ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ

ناسخ

مست ہے عالم مرے اشعار کی تاثیر سے
مثل مینائے ٹپکتی ہے مری تقریر سے

پھر بہار آئی چمن میں داغ دل آنے لگے
آنکھوں میں منتظر ہیں عبث یار کے دل
خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سرِ بلند
ہو گیا گور غریباں میں عیاں حال جہاں
ہر صبح وہی صبح ہے ہر شام وہی شام
رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دل
ناسخ شراب پی شب تاریک ہے تو کیا
جلا نہ آتش سودائے عشق سے جو بیا
یہ رنگ عارض گل رنگ ہے کہ نام خدا
نگہ ٹہرتی نہیں اب عکس پر اس کی
آپ میں دیوانہ پھوڑے ڈالتا ہوں اپنا سر
خاک میں ملتا ہے غیرت رو رو تے ہیں ہم کو غیر
ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں

پھر مرے زخم جگر آتش کے پرکالے ہوئے
آتا ہے ناوک نگہ ناز ادھر کہاں!
آسمان پیش زمیں ہر تواضع خم ہوا
کاسہ سر جو نظر آیا وہ جام جم ہوا
انسان پر ہے زور فقط انقلاب کا
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا
تو واجب اس پہ جہنم کا بس عذاب ہوا
پڑا جو عکس ترا آب میں شہاب ہوا
شعاع حسن سے آئینہ آفتاب ہوا
دست نازک سے نہ مجھ ایسے صنم پتھر اٹھا
اس گلی سے بس ہمارا خاک اپنے سر پر اٹھا
ملی ہے عقل لیکن بخت برگشتہ ہے عاقل کا

[illegible]

خواجہ محمد وزیر وزیر

تعارف: حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں سے تھے اور گوشہ نشین آدمی تھے عربی فارسی کی معمولی استعداد تھی شاعری میں ناسخ کے ایسے شاگرد تھے کہ استاد کو ان پر ناز تھا اور ان کی زندگی میں ان کی استادی مسلم ہو گئی تھی استاد نے اپنے اکثر شاگرد ان کے حوالے کر دیئے تھے ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا سنہ ولادت نہیں معلوم انتقال کے بعد ان کے اعزہ و احباب نے دیوان جمع کر کے ۱۲۷۴ھ میں شائع کیا

گردش چشم مست کی دل میں گیا تھیر
ٹوٹتا ہے دور جام سے شیشہ شراب کا

تھام لو دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اٹھ جائے گا

ہو گیا ہے حسین دل دشمن کی بھی فریاد سے
دل نے جب نالا کیا ٹکڑے جگر ہونے لگا

مر گئی بلبل جو کیا یاد چمن کو
غربت میں خدا یاد دلائے نہ وطن کی

قفس تن میں نہ گھبرائیو اے طائر روح
جو گرفتار ہے اک روز رہا ہوتا ہے

ہم اسیران قفس کو بھی ذرا چین نہیں
دھڑ دھڑکا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

بکھرے ہوئے ہمارے گریباں صبر گئے
انگڑائی میں جو یار کی چولی مسک گئی

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہو گا

آج ہے نامہرباں کل مہرباں ہو جائیگا
اٹھ کے چلے حشر بپا ہو گیا

آج مجھ سے بات اگر کرتے نہیں
دیں گے یہ بت کل خدا کو کیا جواب

افزوں کہیں ہیں حسن میں شمس و قمر سے آپ
آئینہ لے کے دیکھئے میری نظر سے آپ

شکر ہے ان بتوں کے کوچے میں
پہنچے ہیں ہم خدا خدا کر کے

قدر نعمت ہوتی ہے بعد از زوال
پوچھئے لطف جوانی پیر سے

یوسف جو کہتا تمہیں تو بولے
کیا آپ نے مول لے لیا ہے

پہنچی نہ اس کے کان تلک آہ نارسا
کیا فائدہ زمین سے اگر تا فلک گئی

کچھ حال اپنی زلف کے دیوانے کا نہ پوچھ
بس مختصر یہ ہے کہ یہ قصہ دراز ہے

سر پٹکتا ہوں پلا دے مے سر جوش مجھے
ساقیا دور کہ پھر آنے لگا ہوش مجھے

آ گئی لغزش مستانہ کسی مست کی یاد
دور ساغر نے کیا بزم میں بے ہوش مجھے

اس در پہ کیوں نہ آئے چرخ جفا جو کو اضطراب
دل کو کسے قرار کہیں آ گیا نہ ہو

ساغر عمر کو اللہ نے لبریز کیا
جام تو نے نہ دیا اے بت میخوش مجھے

بالوں میں لگاؤں کا غزالان ختن
آنکھوں سے تری سیکھا یا طرز سخن کو

تصویر پیچ کی تو لکھا حشر زیر پا!
مانی سے جب کھچا نہ وہ انداز چال کا

غنچے چمن میں چٹکے چلی ناز سے نسیم!
انداز اڑا یا سب نے تری بول چال کا

راز دل کتنا چھپایا کھل گیا
جان اس دولت سری کا کھل گیا

اگر زمین کی پوچھی فلک کی اس نے کہی
یہ ان کا آدمی اچھا فرشتہ خو آیا

وہ حال پوچھتے ہیں تنہا میں خموشی ہو نہیں
زبان بند ہوئی وقت گفتگو آیا

کب خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائیگا
دوست کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائیگا

جلا یا طور کو جس نے وہی گری بجلی
کہ ہر سخن سے شعلہ آواز گفتگو آیا!

جی ڈھونڈ رہا ہے دل جو کیا دلربا کیساتھ
نا آشنا کو ہم نے کیا آشنا کے ساتھ

کیا کیا نہ ہم کو اپنی عبادت پہ ناز تھا
بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے

یہ دل بدگماں نہ دیکھ سکے
اگر وہ بت کے ہو خدا ہمراہ

بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہ خود فراموشی
دل گم گشتہ آپ خضر ہے اپنے بیاباں کا

کسی کی جستجو میں تخت دل آنکھوں میں آتے ہیں۔
تلاش یوسف گم گشتہ میں ہے قافلہ دل کا

کبھی خورشید نہ افلاک پہ پنہاں ہو گا
لاکھ پردوں میں جو تو ہو گا نمایاں ہو گا

اپنے گناہ آ نہیں سکتے حساب میں
زاہد کو خوف چاہیئے روز حساب کا

دیکھ بہتر ہے۔

محمد رضا برق

تعارف:- ناسخ کے شاگرد تھے، واجد علی شاہ کے استاد اور مصاحب خاص تھے۔ فتح الملک خطاب تھا۔ واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے وہیں ۱۲۷۴ھ میں انتقال ہوا۔ ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا جو شائع ہو گیا ہے۔

نہ کوئی ان کے سوا اور جہان میں دیکھا
وہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا

کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا
نئے لباس میں دیکھا تمہیں جہاں دیکھا

وہ چند اور محبت ہوئی محبت سے
غضب ہوا جو کبھی ان کو بدگماں دیکھا

دیدار کو ترستے ہیں عاشق جمال کے
پر جل رہے ہیں طائر وہم و خیال کے

عاشق زار کہاں تم وہ صنم عشق کہاں
جو فرشتوں سے نہ اٹھے وہ اٹھا لاتے ہیں

بتوں سے جلوہ حق کا ظہور ہوتا ہے
عجیب خاک پتلوں میں نور ہوتا ہے

اذان دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لن ترانی تمہیں زیبا ہے کیسے تاب نظر
غش پہ غش آتے ہیں پردہ جو اٹھا دیتے ہو

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلا ہوتا ہے

بے اثر نالہ نہیں آپ کا ڈر ہے مجھ کو
ابھی کہہ دیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

کب تلک جور و جفا ہم بھی ہیں انساں آخر
حال دل منہ سے کہیں کچھ تو گلا ہوتا ہے

وصل کی رات تو پھر جاگتے میں کٹتی وقت کے
آپ کے جانے کے دن دیکھئے کیا ہوتا ہے

بلاؤں میں وہ دل مبتلا ہو گیا
مجھے عشق گیسو بلا ہو گیا!

مزہ کے ساری رات تو فرقت میں کٹ گئی
لیکن امید آج نہیں ہم کو شام کی

مضطرب سن سن کے وہ رشک قمر ہونے لگا
رفتہ رفتہ نالۂ دل میں اثر ہونے لگا

حسرت موت میں مرتے ہیں مگر تنگ ہے عاشق
ہم سے پوچھو کہ شب ہجر میں کیا ہوتا ہے

دیکھ لیجے گا جو لے مال لقا ہوتا ہے
کیا کہیں ہم سے شب ہجر میں کیا ہوتا ہے

فصل گل آتے ہی عالم میں قیامت آئی
پھر جنوں تازہ ہوا پھر وہی آفت آئی

پھر وہی آئی مصیبت وہی آفت آئی
روز مر مر کے کٹا پھر شب فرقت آئی

خوف کیجے دل مظلوم کی بربادی سے
حشر ہو گا اثر نالہ و فریادی سے

خدا غریب کی سنتا ہے عیب سے فریاد
اثر عجیب دل دردمند رکھتا ہے

شہرت بجا جہاں میں اس خود نمائی کی ہے
ویسے بشر بھی ہوتے ہیں قدرت خدا کی ہے

ساقی ہے مے ہے باغ ہے ابر سیاہ ہے
اس وقت میں شراب نہ پینا گناہ ہے

کوکیں ہیں کوئلوں کی پپیہوں کے شور ہیں
طاؤس رقص کرتے ہیں دن ہیں بہار کے

زلفوں میں دل الجھ کے سفر تن سے کر گیا
اچھا ہوا بلا سے چھٹے درد سر گیا

ناسخ میں لاکھ بار جیا اور مر گیا
کیا کیا فراق یار میں مجھ پر گزر گیا

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی
جھپٹی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

راحت بھی کم از غم نہیں دل جبکہ خالی ہو
سر سر مجھے چبھو نکالے نسیم سحری کا

بحر عالم میں رہی کشتی امید تباہ
دم بدم موج حوادث نے تماچا مارا

خاکساری کا جہاں میں سب سے عالی رتبہ ہے
یہ زمیں وہ ہے کہ جس پر آسماں ہوتا نہیں

سبزہ باغ دہر میں برگ خزاں ہوتا نہیں
پیر ہو کر پھر بشر کوئی جواں ہوتا نہیں

غیروں کا حال دیکھ کے روتا ہوں زار زار
پوچھو نہ حال میرے دل دردمند کا

غم اتنے اور بڑھے جس قدر وقار بڑھا
ثمر سے نخل ثمردار سنگسار ہوا

عیاں ہوتا ہے راز عشق سینہ میں نہاں ہو کر
بیان کرتی ہیں آنکھیں حال دل ترجمان ہو کر

ڈر غرق عشق کو موج حوادث کا نہیں
مچھلیوں کو خوف کیا ہے مد سیلاب کا

قوت بازو حمیت نہیں فقط آتا نہیں
سر کی آفت اٹھانے کو چاہیں دو ...

تکلیف کیوں اٹھایئے بن بن کے ہوشیار
مرتا ہوں میں تو اہل جنوں کے شعور پر

میر علی اوسط رشک

تعارف:۔ ناسخ کے شاگردوں میں بڑا درجہ رکھتے ہیں ان کے بنائے ہوئے قاعدوں پر عمل کیا اور ان قاعدوں کی روشنی میں نئے قاعدے وضع کئے ناسخ کے زمانے کی بعض بھونڈی لفظوں اور ترکیبوں کو ترک کیا اور ان کے جانشین کی حیثیت سے مسلم درجہ رکھتے تھے آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے وہیں ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں انتقال ہوا۔

نہ ہوا وقتِ خزاں ضبطِ فغاں و نالہ — بات تھی جو صدمۂ مرغِ چمن سے باہر

ہم تجھ میں محوِ قدرتِ پروردگار ہیں — اک مشتِ خاک کو مہِ انور بنا دیا

جو ساغر و مینا نظر آیا مجھے حنا لی — یاد آ گیا ساقی دلِ مایوس بھر آیا

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں گل — تصویرِ روئے انورِ جاناں کہاں نہیں

یا رب وہاں و چشم و دلِ زار کیا کروں — فریاد و اشک و آہ کسی میں اثر نہیں!

دل نہ قابو میں ہے نہ دلبر ہے — موت اس زندگی سے بہتر ہے

ایذائے دل بیان کروں کس زبان سے — یا رب کبھی کسی کو یہ دردِ نہاں نہ ہو

موت آئے مجھے اجل مجھے اے ہمسفر اگر — ساقی نہ ہو بہار نہ ہو جانِ جاں نہ ہو

بتوں کو دل مبتلا چاہتا ہے — کوئی گرد آفت گرا چاہتا ہے

ہجرِ جاناں میں کہیں جینے سے مرنا بہتر — زندگانی کے مزے کو یہیں گھٹتے دیکھا

بیڑیاں ہاتھوں میں اور اطفال سنگ انداز گرد — لوگ کہتے ہیں مرا آنا غل بعد حشر ہونے لگا

کس کو تابِ نظارہ باقی ہے — رکھتے ہو چہرے پر نقاب عبث

غمِ دل سوزِ جگر داغِ فراق ! — میرے مرنے کے تھے کیا کیا باعث

ناصحو عشق میں رکھو معذور — جانتا ہوں کہ برا کرتا ہوں

شیخ بگڑے کہ برہمن بگڑے — میں ترا نام لیا کرتا ہوں

پھر کسی کا ہے لبِ لعلی کا دل آئینہ — ششدر رہوں کارخانۂ دردِ جہاں میں

ہجر میں ابلقِ ایام بھی کاوش میں رہا — باندھا میری سواری میں یہ گھوڑا الٹا

کرتی ہے غرقِ یمِ غم آرزوئے دل — ملتا ہی نہیں کچھ تمنا کا کنارہ

ہاتھ آیا لطفِ حسن سراپا اٹھا لیا — دنیا سے ہمت نے دستِ تمنا اٹھا لیا

ترکِ دنیا کرتے ہی کھلنے لگے اسرارِ غیب — باخبر ہونے لگا جو بے خبر ہونے لگا

دل بستۂ لطافتِ باغِ جہاں نہیں — پروا نہیں جو رنگِ بہار و خزاں نہیں

نخلِ امید کسی روز نہ پایا سرسبز — گلشنِ عمر میں پیوستہ خزاں رہتی ہے

عیش ممکن نہیں مجھ کو چمنِ ہستی میں — جب بہار آتی ہے تشویشِ خزاں رہتی ہے

دمبدم وادیٔ الفت میں جنوں کہتا ہے — فہم کہتے ہیں جسے عقل کہاں رہتی ہے

جو کہ خالی ہو علائق سے اسے غم کس کا — نے سے پوچھے کوئی کیوں گرمِ فغاں رہتی ہے

ہوں وہ خود رفتۂ الفت کہ مجھے معلوم نہیں — زندگی کہتے ہیں کیا روح کہاں رہتی ہے

دوستِ جاناں جسے وہ دشمن تھا — بس اسی اشتباہ نے مارا

چمنِ دہر میں وہ طائرِ خوش قسمت ہوں — کہ ہوا دامِ مصیبت سے دمِ چند جدا

بحرِ غم میں ڈبو دیا ہم کو — دل نے بیڑا ہے خوب پار کیا

سال جو صرف ہوا ہجر کے کہاں آتا ہے — کبھی دیکھا نہیں بہتے کو دریا آتا

محو اپنا ہے دیکھئے جس کو — حق پرستی کا ہوش ہے کس کو

ہو گا ہم چہرہ روئے دلبر کا — منہ کبھی دیکھئے ماہِ انور کا

روتے ہیں ہجرِ یار میں بیٹھے ہیں انتظار میں — اب دلِ بیقرار میں نام نہیں قرار کا

جس کی آبادی اجاڑی آپ نے — نام دل تھا اس خرابہ آباد کا

حلق سے نکلی خلق تک پہنچی — ہم سے سو بار آزمائی بات

مطلب یہ ہے عدو کے شکستِ حباب کا — دیکھا بنائے ہستیٔ ناپائیدار کو

صحنِ چمن ہو خیمہ دورِ سحاب ہو — ساقی ہو یار ہو قدحِ پُر شراب ہو

شکوہ ہو ایک خانہ دل ہو اگر خراب
اس عشق فتنہ گر نے کیے گھر کے گھر تباہ

ہجر میں تاب و تواں ہوش و حواس
سب گئے دھیان تمہارا نہ گیا

مجھے تھا کام آئینے سے یا زلفیں سنوارنے سے
ہم اپنے حال آشفتہ میں حیران و پریشاں تھا

سنا رہا ہوں نکیرین کو فسانۂ ہجر
سوال ان کے جدا ہیں مرے جواب جدا

وہ کوٹھے پر چڑھے دنیا میں چاندنی چھٹکی
سدھارے باغ میں جب وہ مژدہ بہار آیا

دل و دیدہ پہ گیا اجارہ ہمارا
نہ صحرا ہمارا نہ دریا ہمارا

تم نے کیوں عشق میں چھپائی بات
آخر اے رشک مہ پہ آئی بات

قسم اول تو تیرے عارض تاباں میں ہے
اس سے کم سبحہ میں ہے اس اختر کے چاند میں

سعد شب ہجراں کی درازی حد بیاں سے باہر
بات آئی تو صبح ہے عنقا دن آیا تو شام

گھر کا دروازہ اسی جا کھلا رکھتا ہوں میں
جس طرف سنتا ہوں شہرہ آمد سیلاب کا

ارباب فنا ڈوبنے کا غم نہیں کرتے
دریا میں پھرا کرتی ہے یہ خرقۂ خطر نوح

عمل ٹھیک دیدار اک روز ٹھہرا تا ہے
بیچ بھنور میں نہیں دیکھتے بیڑا الٹا

اپنی پہچان ہے انسان کو عرفان کی شناخت
آپ تک جو کوئی پہنچا وہ خدا تک پہنچا

جلوہ یار سے روشن ہے زمانہ دن رات
کہیں خورشید کہیں شمع شبستاں نکلا

تو نظر آئے دیکھیے جس کو
احد توحید کہتے ہیں کس کو

یاد آیا میکدے ملاں مزاج یار تھا
یاس میں امید تھی اقرار میں انکار تھا

بیچ دریا پہنچ کر گو تم قسمت عذر کی
بحر غم سے پار اتر جاتے تو بیڑا پار تھا

کیوں نہ مرتا عاشق چشم و لب زلف و کمر
زار تھا آشفتہ تھا خاموش تھا بیمار تھا

اے خدا کوئی نہ دیکھے مرض الفت چشم
دم اس انداز میں آنکھوں سے نکلتے دیکھا

اب جہاں شام و سحر ہے ہمارا غم و رنج
شام ہوئی تو صبح لائے صبح ہو تو شام نہیں

کیا قصہ الست و بلا کی خبر نہیں
حاضر جواب ہم تو ازل سے بلا کے ہیں

بعد مردن خاک کا انبار یا لوح مزار
اے اجل اس کو گیا خاک پھر چاہیے

ہے مائل عیادت اگر یار کا مزاج
بہلے گا سیر باغ سے بیمار کا مزاج

نہ کرے باغ میں خزاں جو کچھ
مجھ سے تو نے وہ آئے بہار کیا

ہوں اسیران بلا میں وہ گنہگار قدیم
کبھی کھلتا نہیں دیکھا در زنداں جب سے

مجھ کو بدنام کیا درد کا ہو جائے برا
کہ لب پیکر تصویر بھی فریاد نہیں

اور آمد شد جانانہ کے مشابہ کیا ہے
دم کو آتے کبھی دیکھا نہ نکلتے دیکھا

مدت سے دل کے ہے داغ ہجراں بھی
عمران دونوں کی برابر ہے

دیکھا جو چشم غور سے دونوں کا حال ایک
گردش چشم یار کا گردش روزگار کا

تصور تھا جو اس آئینہ رو کا قید خانے میں
جلا تھا رتبہ آئینہ ہر دیوار زنداں کو

کرے نگاہ بصارت کی کیا حقیقت ہے
وہ لب ہے قدرت پروردگار کی صورت

کہاں شبیہ خیالی مانی و بہزاد
کہاں وہ خامہ قدرت نگار کی صورت

سمجھوں جو مدعا تو لکھوں کچھ جواب کیا
تقریر سے زیادہ ہے تحریر لاجواب

مشتاق سیر لالہ دل داغدار ہے
ہنگام آمد آمد فصل بہار ہے

قتل کرنے کو خوش اندازی کا جوہر چاہیے
کون کہتا ہے کہ تیغ و تیر و نشتر چاہیے

کمال تنگ ہوا ہوں جہان فانی سے
دیا خدا نے عجب خانہ خراب مجھے

راستہ صبح سے اے رشک قمر دیکھیں گے
آج ہم شام سے آہوں کا اثر دیکھیں گے

جب تک عوض صبح نہ ہو صبح قیامت
لطف اثر نالہ شبگیر نہیں ہے

شمع میں لو نہ سوز دل پروانہ رہا
کچھ کہیں بھی نہ رہا جب ترا جلوہ نہ رہا

صبح سے ہیں قائل تاثیر وحشت اہل ہوش
بکتے بکتے مجھ سے ناصح ہو گیا دیوانہ آج

ہمیں خدا نے کیا اب و تاب غنچہ و گل
چمن کی سیر کرو ڈال دو بہار میں سوح

ہوا ہے تنگ جہاں اب کی وحشت دل میں
کدھر میں جاؤں زمیں آسماں سے باہر

باتیں وہ کر رہا کہ ہیں ریختوں کے بول
یہ ساز میں صدا ہے یہ لطف راگ میں

امداد علی بحر

تعارف امام بخش کے بیٹے اور امام بخش ناسخ کے شاگرد علمی استعداد کا حال معلوم نہیں۔ تحقیق الفاظ و محاورات عروض و قوافیہ میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ چھوٹی شہزادی کے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا اور انہی کی ڈیوڑھی کے بغلی کمرہ میں قیام تھا۔ انہوں نے کے حادی تھے۔

کچھ دنوں کے لئے رام پور بھی گئے تھے مگر پھر لکھنؤ واپس آ گئے۔ ۱۳۰۰ھ میں ۹۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔

ہر خاک نشیں مظہر انوار خدا ہے
ہر دانۂ ذرات میں خورشید نظر آیا

یہ کہہ دو کوچۂ جاناں کے جانے والوں سے
اُدھر جو کوئی گیا پھر ادھر نہیں آیا

عذاب نزع ہے قاصد کا انتظار مجھے
اجل ہی آئے اگر نامہ بر نہیں آتا

جیتے جی عاشق بیتاب کا کب دل ٹھہرا
روح جب کہہ گئی پرواز تو بسمل ٹھہرا

یہ راز عشق رہے دل ہی میں تو بہتر ہے
ادھر زبان سے نکلا ادھر فسانہ ہوا

عشاق کی تقدیر میں آرام نہیں ہے
کیا سمجھو شب وصل کو دھڑکا ہے سحر کا

گو وہ چپ بیٹھا ہے پر شوخی کی باتیں ہو رہی
ہے لب خاموش پہ عالم لب تصویر کا

کہاں وہ غنچے وہ اب سیر چمن فریاد کیسے ہیں
ہوا دی شوخی نے ورق الٹ گیا

ہمارے حق میں یہ وہ میری بلا سے آسماں ہے
شب فرقت کا جانا اور آنا روز محشر کا

کسے کہا دل اپنا شیشہ سا کوئی کمی
جہاں میں لیکر ہزار ڈھونڈھا مزاج پایا نہیں کسی کا

کوئی سجدہ تری درگاہ کے قابل ہوا
لے چلا داغ جبیں رہیں جبیں سائی ہے

آدمی گردش ایام سے غافل ہے
شام کیا ہوگا خدا جانے سحر کیا ہوگا

دوڑتا دوڑا ہے اسلام و کفر سے
زاہد ادھر خراب اُدھر برہمن خراب

روئے کوئی غریب تو ہنسنا نہ چاہیے
واقف نہیں کسی کی فغاں اثر سے آپ

اے دل نہ چھیڑ بھاڑ میں گم ہو ترے حواس
سینہ میں حسرتوں کا نہ اتنا ہجوم کر

ہے موج نسیم سحری ہونٹوں کی جنبش
ہنستے ہو تو ہو جاتا ہے غنچہ سا دہن کچھ

بروز وعدہ کہاں اٹھ گئے یہ فرماؤ
مکاں میں رہیے اے یار بامزا ہیں ہم

یہ بات سچ ہے کہ دنیا مقام عبرت ہے
کہ خواب دیکھتے ہیں جب خیال کرتے ہیں

رونے دھونے سے فائدہ بحر
کب سینے کے داغ چھوٹتے ہیں

کوئی آداب محبت کو بھلا کیا جانے
دلشیں جتنی ہیں عاشق کی وہ توقیریں ہیں

جو میری عرض ہے وہ نہیں یار کو قبول
بندے کی جو خوشی وہ خدا کو خوشی نہیں

عشق کیا درد ہے خداوندا
کوئی دارو کوئی دوا مفید نہیں

کیا برا درد ہے جدائی کا
کسی کروٹ مجھے قرار نہیں

بے تابیاں یہی ہیں تو بے موت نجات ہے
صیاد با وفا ہیں یہی نہیں یا قفس نہیں

میں قسم کھا کے یہ کہتا ہوں کہ مے نوش نہیں
آنکھ دیکھی وہ نشیلی کہ مجھے ہوش نہیں

شانہ کا محتاج نہیں حسن خداداد
تم چاند نظر آتے ہو بے ساختہ ہو میں

معاف کیجئے ایسی خطا نہ ہوگی کبھی
برا کیا تمہیں چاہا گناہگار ہوں میں

بہار آئی ہے کہہ دو یہ ہم صفیروں سے
چمن کا ذکر اسیروں کے روبرو نہ کرے

ترے ملاپ میں دونوں جہاں کی عشرت ہے
جو تو ملے تو کسی شے کی آرزو نہ کرے

اللہ ہی بچائے اجل کا ہے سامنا
فرقت کی شب کہاں ہے چنانچہ سحر کہاں

قبلہ ہے کس طرف میں دو ... ادا کرو
صاحب قدم تمہارے کہاں سر کہاں

صاحب ہنر کو آج کوئی پوچھتا نہیں
یارب تلاش رزق کرے بے ہنر کہاں

کچھ نہ سمجھے آئینہ کی شکل حیرت میں ہے
ایک ہے دیکھا نہ دیکھا عالم ایجاد کو

کیوں نہ بند آنکھیں کیے دنیا سے جائے بشر
اس پری کو دیکھ کر کیا دیکھے کوئی حور کو

عاشق زار ہوں میں مجھ کو نصیحت ہی بھری
ذبح کرتے ہیں جو لوگ آتے ہیں سمجھانے کو

دیکھنے دیتے نہیں کان رخِ زیبا کو
مار ڈالے گا مجھے عشق یہ معلوم نہ تھا
بسمل کو سنبھالے سے سنبھلتے نہیں دیکھا
کب مجھ سکوں گل کو جو تقدیر میں ہر داغ
دل کو لگی ہے تو انسان سمجھتا نہیں کچھ
ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی
گلے شکوے نہ کر ارض و سما کے
ہم نے ڈھونڈا نہیں ہستی سے عدم تک کیا کیا
شراب مانگے گئیں خضر سے بھی طلبِ آبِ بقا کر نکلے
اب ان میں اپنا نہیں گناہ بتوں سے دل کی لگی کا سہارا
جو ہر اس حسن پرستی میں وہ پیدا کرتے
روزِ تقسیم ہمیں کچھ نہ بن آئی آسے تجر
نیرنگیٔ دنیا کا تماشا ہے نمایاں
ہم خزاں کی اگر خبر رکھتے
یار کی دونوں آنکھیں قاتل ہیں
پار اتر جائے مددِ غیر سے کیا لطف اے تجر
جنوں کے جوش میں نکلے جو گھر سے
چرخ کے ہاتھوں تہ و بالا ہیں دل ٹوٹا کیے
ہوئی تفریح مجھ کو پھاڑ کر پوشاکِ خستہ میں
عجب یہ رسمِ محبت ہے جس نے ظلم کیا
ناقوس کی آواز سے جو نکلا نہ اذاں سے
دیکھوں انجام مرے عشق کا کیا ہوتا ہے

بجلیاں کوندتی ہیں تابِ نظر کیوں کر ہو
ناگہانی ہو جو شے اس کی خبر کیوں کر ہو
میرے دلِ بیتاب کی کیا چارہ گری ہو
جب فصلِ چمن آئے تو بے بال و پری ہو
نالے کرنے سے مجھے کام اثر ہو کہ نہ ہو
بہار دیکھ چکے باغِ زندگانی کی
خدا کو یاد کر بندے خدا کے
نہ ادھر ہاتھ لگے تم نہ ادھر ہاتھ لگے
سرور لطفِ زندگی ہے خمار میں جی کیا کریں گے
کریں گے بت خانے سے کنارا حرم میں یادِ خدا کریں گے
دل کو آئینہ بنا کے تجھے دیکھا کرتے
لیکھ بگڑی ہوئی تقدیر کو ہم کیا کرتے
غفلت اسے کہتے ہیں کہ عبرت نہیں ہوتی
آشیانے میں پھول بکھرے رکھتے
اک نظر ہم کدھر کدھر رکھتے
ڈوب بیٹھے یہ نہ کشتی کا سہارا کیجیے
ادھر سے ہم چلے پھر ادھر سے
اس ہنڈولے میں کوئی بیٹھا نہیں آرام سے
درحقیقت نظر آیا مجھے چاکِ گریباں سے
اسی کی خدمتِ عالی میں دادخواہ چلے
کس نیند سلایا ہے مجھے بے خبری نے
بت خفا ہوتے ہیں ناراض خدا ہوتا ہے

پھول مرجھائے ہوئے دید کے قابل کب ہیں
شوقِ دیدار جو منظور نظر اس کا نہیں
بت کدہ میں سر بسجدہ کعبہ میں سیاہ غریدت
بیمارِ محبت کا خدا حافظ و ناصر
روز اک تازہ بلا در پئے جاں رہتی ہے
آنکھیں نہ جینے دیں گی تری بے وفا مجھے
بتلائے کون کعبۂ مقصود کا پتہ
سیر کو اٹھے تو ہیں وحشی مزاج
توڑ کر دیکھ لے آئینہ کے ٹکڑے ناصح
کیا اعتبار تیری قسم کا تو وہ ہے یار
دل بھی ہے ایسی چیز کہ تم کو نہ دیجیے
بنی ہے جان پہ ایسی کہ اب نہیں امید
خدا پرست ہوئے ہم نہ بت پرست ہوئے
اپنے اعمال سے پیری میں خبردار ہوئے
ہر طرف لوگ تماشے کو کھڑے رہتے ہیں
تیلیوں کو اور ہی صورت نظر آنے لگی
کچھ اعتبار نہیں قول و فعل کا ان کے
ہیں گلہ تم سے کریں اے یار کس کس بات کا
اس چمن میں پیچ کر کس کس نہیں پہنچا مجھے
آغازِ جوانی ہی میں پیرانہ سری تھی
کون دنیا میں بٹاتا ہے کسی کا دکھ درد
میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں وہ قاتل نہیں ملتا

آنکھ پڑتی ہے اسی پر جو کھلا ہوتا ہے
ہم جدھر دیکھتے ہیں جلوہ ادھر ہوتا ہے
پھر اپنے خوابِ غفلت کی یہی تعبیر ہے
تشخیص یہ ٹھہری ہے کہ تدبیر یہی ہے
نہیں معلوم مری موت کہاں رہتی ہے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے
اپنا ہی دل جو قبلہ نما ہو تو جائے
باغ جاتے ہیں کہ صحرا دیکھیے
کیا مجھے طرزِ حسن پرستی کی جسے خو ہو جائے
فردا کا وعدہ کر کے قیامت پہ ٹال دے
الفت یہ کہہ رہی ہے کلیجہ نکال دے
کوئی گھڑی کوئی ساعت کوئی پہر گزرے
کسی طرف نہ جھکا سر ہم ایسے مست ہوئے
سوتے تھے سر پہ جو دھوپ آئی تو بیدار ہوئے
ہم جو دیوانے ہوئے رونقِ بازار ہوئے
جب ہوا دل آئینہ آنکھ کو حیرانی ہوئی
کبھی بہار سے ہوئے اور کبھی پرائے ہوئے
یہ کہانی دن کی ہو جائے نہ قصہ رات کا
شکوہ گلچیں کا کروں یا گلہ صیاد کا
وہ شام ہماری ہے کہ عالم ہے سحر کا
کون سر پہ بوجھ لیتا ہے کسی مزدور کا
گھر بھول گئی ہے مری تقدیر اجل کا

امان علی سحر!

تعارف:- ولادت و وفات معلوم نہیں ناسخ و برق کے شاگرد اپنی شہرت کی بدولت واجد علی شاہ کے دربار میں طلب ہوئے اور وظیفہ پایا بڑے جامہ زیب اور کبر طور کے شوقین تھے غدر کے بعد وفات ہوئی۔

ہر خشک و تر میں تو ہے سبب ظہور تیرا
مجھ کو بھی خلد میں ہو گی تو بس ایسی ہو گی
کس انداز ہوں کے نقشے نقش دل پر ہو جاتے ہیں
وصل یار ہے مرنے پہ موقوف
قید ولئے اہل شرع کی دیوانہ کر دیا
جیتے جی انساں آتے ہیں فرشتے بعد مرگ
ایک معشوق وہ ہیں اور زمانہ عاشق
کوہ پہ فرہاد پہنچا دشت کو مجنوں گیا
بعد از فنا بھی جبیں ملے یہ یقین نہیں
خوش قطع کس قدر ہے قبائے برہنگی
دل دیا اللہ نے صدمے اٹھانے کے لیے
راحت کی خوشی رنج کا کچھ غم نہیں رکھتے
بیٹھے بیٹھے تو پڑ کر ادھر دیکھ لیتے
ہمیں کیا جو تربت پہ میلے لگے ہیں
گو زار و ناتواں تھے لیکن ہنسی خوشی تھے
دنیا کو چھوڑ بیٹھے ہیں جب کو دیں آپ کے
گردش چرخ سے تنگ آیا ہوں دم گھٹتا ہے

دل میں جگہ ہے تیری آنکھوں میں نور تیرا
آج ان پریوں میں دیکھا ہے اک انساں نیا
یہی صورت میں اس ویرانہ کو آباد ہونا تھا
جو یہ سچ ہے تو کچھ مشکل نہ ٹھہرا
کیسے گنہگار ہیں بے قصور ہم
گھر یہ کیا ہے گور میں بھی کنج تنہائی نہیں
کیا کریں وعدہ فردا لے قیامت نہ کریں
ہم کہاں ہیں کچھ ہمیں اپنی خبر ملتی نہیں
کیا گردش آسماں کی زیر زمیں نہیں
دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں
ہم فقط پیدا ہوئے تھے آزمانے کے لیے
لی لب پہ کوئی شے کا وہ دل ہم نہیں رکھتے
کہ ہم اور اک نظر دیکھ لیتے !
نہ سمجھو ہم تو اکیلے رہے
اک مشت استخواں تھے اور لاکھ ہتھ جال تھے
آگر کبھی تو سیر لب بام کیجئے
آخر اس گنبد بے در کی کہیں ملتی بھی ہے

ہم بے بلائے تو ہمیں جائے خدا کے گھر
تب فرقت میں اٹھائی ہے جو ایذا ہم نے
زندگی ہے تو بہر طور گزر جائے گی
حشر میں حشر قیامت میں قیامت ہو گی
کچھ زمانے سے طبیعت بھی ہٹی جاتی ہے
پیہم جو تازیانہ تار نفس سے لگے !
راہ دکھلائی خوب وقت اخیر
پاس آ بیٹھے تو دل اٹھ گیا اک عالم سے
بہت پچھتائے تم کو پیار کر کے
میں پھروں تختۂ نرگس کو دیکھتا ہوں سحر
فقط مقسوم سے اپنے گلا ہے
دل کا آئینہ اگر ہم نہ دکھاتے تم کو
کوہ و صحرا کے بھی وحشت میں نہیں کچھ پابند
آج جو کچھ کہ ہوا کل بھی وہی ہونا ہے
غریبوں کا کیسا مزاج مبارک
صدمے فرقت کے نہ اٹھتے ہیں نہ اٹھیں گے سحر
ہے سامنے مرقع یاراں رفتگاں
عجیب لطف تھا کچھ ابتدائے وحشت میں
دل نے پھر دل سے راہ پیدا کی
آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے واسطے
کسی کی گور میں سونا نہیں ہے

جانا نہیں بغیر طلب کیا ضرور ہے
شکر کرتے ہیں تو ہوتی ہے شکایت تیری
کٹ چکی ہجر کی شب صبح بھی ہو جائے گی
فیصلہ اپنا اسی دن پہ اٹھا رکھا ہے
زندگی موت کے دھڑکے میں کٹی جاتی ہے
کوسوں سمند عمر گریزاں نکل گیا
آنکھوں کی راہ دم مرا نکلا !
اب جو اٹھ جاؤ گے لئے رشک قمر کیا ہو گا
گناہ عشق کی پائی سزا خوب
بندھی ہوتی ہے عجب انتظار کی صورت
کسی سے کچھ نہیں شکوہ شکایت
آنکھ ہوتی نہ محبت کی نظر سے واقف
کر دیا عشق نے ہر قید سے آزاد مجھے
کب یہاں مانتا ہے وعدہ فردا کوئی
یہ پوچھو کہ بگڑی طبیعت تمہاری
صبح کے ہوتے ہی اپنا خاتمہ بالخیر ہے
روؤں بھلا سحر میں کس کس کو یاد کر کے
وہ ولولہ وہ جنوں اب کی سال بھی نہ ہوا
چھپ کے جانے کا راستہ نکلا !!
دیکھیں گے جو کچھ خدا دکھلائے گا
ہمیں کیا یار کے مذہب سے مطلب

آتش اور ان کے تلامذہ

آتش

بھر ڈالا کیا مرقع عالم کے حسن پر
ہر روز عشق اک نئی تصویر سے ہوا!

جوشِ جنوں میں دیکھیے پہنچے نہ مڑ کے پھر
منھ جس طرف کہ صورتِ دریا اٹھائیے

ہم کو درپردہ محبت غائبانہ عشق ہے
لن ترانی ان سے ہو سائل جو ہو بیباک سے

کر کے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل
بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیراں ہو گیا

بیانِ خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

اس بلا جان سے آتش دیکھیے کیونکر بنے
دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خو ہے وہ

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے
موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا!

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی جفاؤں کا گلہ جاتا رہا

کوئی زمانہ جاتا ہے کوئی آتا ہے
کسی کو کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

وہی سر کا ٹپکنا ہے وہی رونا دن بھر کا
وہی راتوں کی بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کیا کہوں وعدہ خلافی سے تری احوالِ شب
کھول کر دروازہ کو کرتا ہوں سو سو بار بند

تمام رات ہوئی کر گیا کنارا چاند
اتر ہٹے بام سے تم جیسے ادھر ہالا چاند

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا
سلام جھک کے کروں گا جو پھر حجاب آیا

شیشہ میں جو ہے روشنی بادۂ گلگوں
فانوس میں یہ شمع کا عالم نہیں ہوتا

موسمِ گل کی ہوا لے کے ساغر بیکار
بطِ مے اڑ کے لبِ جو کو چھو آتی ہے

سبوئے غنچہ ہے معمور و جامِ گل لبریز
ٹپک رہی ہے شراب ابرِ نوبہاری سے

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

آئینہ میں پری سے چہرہ کو دیکھتے تو
کیونکر بھلا محبت تم سے بشر نہ کرتا

منھ نہ دیکھا ہو ترا اس رشک سے جلتا ہوں میں
اے صنم جب پوچھتے ہیں گبر و ترسا آفتاب

ایک گل ایسا نہیں ہووے نہ خزاں جس کی بہار
کون سے وقت ہوا تھا یہ گلستاں پیدا

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا!
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ قبرِ سکندر ہے نہ ہے گورِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

باغِ جہاں کو یاد کریں گے عدم میں کیا
کنجِ قفس سے تنگ رہے آشیاں میں ہم

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

کام کرتی رہی وہ چشمِ فسوں ساز اپنا
لبِ جاں بخش دکھایا کیے اعجاز اپنا

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو
گلِ تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا

کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل میں داغ ہیں
اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا

طلبِ دنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیال آبروئے ہمتِ مردانہ آتا ہے

تماشا گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں کے نہ تھے
زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے نہ تھے

سعی لاحاصل مداوا اے مریضِ عشق ہے
تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

ناگفتنی ہے حال بہار و خزانِ باغ
اک زخم ہے کہ خشک ہوا اور نم ہوا

صورت شمع ہوں ہرچند فروغ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

موسم گل کر دیا ان کی قبائے سرخ نے
چاک تا دامن ہزاروں ہی گریباں ہو گئے

تم اندھیری رات میں الٹو جو چہرے سے نقاب
روئے رشک مہر ذروں کو جگا دے خواب سے

وہ آب رنگ کہاں شیشۂ یار کا گل پر
ہزار آنکھ ہو نرگس کی وہ نگاہ نہیں

وہ رخسارے جو چھپتے ہیں مقابل
نکل جاتے ہیں دب کر چاند سورج

آئینہ نے کیا ہے جو صورت سے آشنا
گردن میں ان کی ہاتھ ہیں ان کے پڑے ہوئے

کر کے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل
بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیران ہو گیا

شوق ہے دل میں تو آنکھوں میں تصور اس کا
منزلیں جلوۂ محبوب کی آباد ہیں سب

آئینہ خیال کو منظور تو رہا!
جب سامنا ہوا تری تصویر سے ہوا

ہر لحظہ دگرگوں ہے مرا حالِ پریشاں
صورت نہیں ملتی مری تصویر میں میری

ہو گیا عشق حسن سے آگاہ!
پوچھئے کیا ہو ناگہانی کی

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامان یار
کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا

کارواں تک سوزِ واماندوں کو پہنچا ہی گیا
اے جرس شاہد ہوں تیرے نالہ کی تاثیر کا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
اس بت کے آستانے کا پتھر رگڑ گیا

خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے
ارادہ کون سے در پر کروں میں دادخواہی کا

غنیمت جان اے دل جنبش ابروئے قاتل کو
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

دم آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے
رقیبوں نے محل باقی نہ رکھا عذر خواہی کا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

نہ چھوٹے گا چھڑائے سے ارے قاتل ترے خنجر کا
وفادار دل کے خوں کا داغ کیا دھبا ہے کیچڑ کا

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کے نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

بتوں کے قہر و غضب کا کسے ہے اندیشہ
خدا نہیں یہ پیمبر نہیں امام نہیں!

نہ تجھے دماغ نگاہ ہے نہ کسی کو تابِ جمال ہے
انھیں کس طرح سے دکھاؤں میں وہ جو کہتے ہیں کہ خدا نہیں

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شب تار نہ ہو

ترکِ الفت کا ارادہ نہ کر آتش زنہار
دل سے بیزار تو ہے جان سے بیزار نہ ہو

خون ہوا جاتا ہے دل کیا دیدۂ تر خشک ہو
روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں زخم کو کم خشک ہو

ذات باری کو کیا ظلم بتاں نے ثابت
عدل کرتے یہ اگر ان کی خدائی ہوتی

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

گور میں بھاگ اہل دنیا سے
خلوت اس انجمن سے بہتر ہے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے
جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے

کرتا ہوں جو میں حسرت پرواز میں نالے
صیاد کو غم ہے مری بے بال و پری کا

شرط وفا کی کسی بے وفا سے کی
آتش سا عارف آگاہ بھولا

نہ کسی کو کڑی کہی صنم نے
نہ کسی کی کڑی اٹھائی بات

موسم گل میں جو ہوتا ہے زیادہ سودا
دوڑتے پھرتے ہیں ہم باغ کی دیوار سے سر

آتش آغاز محبت کا ہوا انجام بخیر
خاک پر تیری قدم رنجہ گل اندام کریں

نہ روز حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے
جفائے یار کے آڑے مری وفا آئی

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

رفیق حال برے وقت میں نہیں کوئی
شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں

نواب سید محمد خان رند

نبیرۂ نواب نجف خان وزیر اعظم ہند

۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا آتش کے شاگرد تھے ان کے بہت سے شعر اور مصرعے ضرب المثل بن گئے ہیں۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

بیٹھے تجھ سے بھی لگا کر نہ کبھی اس دل سے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

آنکھ لا سکتی نہیں تاب تجلائے جمال
عالم نور ہے اے نور سراپا تیرا!

چشم و ابرو بھی اگر تیر سے ہوتے اس کے
ہو چکا تھا اثر رخ خورشید پہ دھوکا تیرا

اختیاری ہی نہیں ہر بار یہ ایسی شکل
کھینچ کیا صانع ایجاد سے نقشہ تیرا

آفت شب تنہائی کی ٹل جائے تو اچھا
گھبرا کے یہ دم آج نکل جائے تو اچھا

کئے جو نالے تو نکلا بخار سینے کا
بھرا ہوا تھا ہمارے دل میں یہ دھواں کب کا

غرض نہ تیر سے مقصد نہ کچھ سوا اے دوست
تجھی کو ڈھونڈھ رہا ہوں کہاں کہاں کب کا

جنون اب اور بتا کوئی شغل بیکاری
اڑا چکا ہوں گریباں کی دھجیاں کب کا

جو جس کے حق میں تھا وہ بہتر بنا دیا
مجھ کو فقیر تجھ کو تو نگر بنا دیا

غافل مقام رشک نہیں چاہئے شکر ہے
سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا

جام کو منھ سے لگانے کی نہ پہنچی نوبت
چشم مخمور نے ساقی کی یہ بیہوش کیا

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر
اور دو روز ہوا باغ کی کھا لے بلبل

کیا ملا عرض مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

پھینک دو دور نگاہیں ابھی جیب کے پہلو اپنا
تم پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

بہے گی کب تلک چشم تر جب سے گی
یہ ندی چڑھی ہے اتر جائے گی

طبیعت کو ہو گا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

نہ تڑپے ترا دل یہ ممکن نہیں
محبت ہے کام اپنا کر جائے گی

شب ہجر میں تھی کسے امید سحر
رات کاٹی خدا خدا کر کے!

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

یکساں ہے دم کی آمد و شد ہجر یار میں
آیا تو کیا ہوا جو نہ آیا تو کیا ہوا

نہ کھلواؤ میری زباں چپ رہو
کوئی بات منہ سے نکل جائے گی

بلبل کو سوئے رنگین اپنا دکھا کے آئے
لو باغ کو گئے تھے یہ گل کھلا کے آئے

طبیعت کو تسکین دم بھر نہیں
الٰہی یہ کیونکر سنبھل جائے گی

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

اجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

خبر نہیں کسے کہتے ہیں گل چمن کیا ہے
قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد

اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

قفس کو شام سے لٹکائے فرش خواب کے پاس
سنا کیا مری تا صبح داستاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے

کس طرح ڈھونڈھ نکالیں تجھے ہو یا تیرے
نہ نشاں ملتا ہے تیرا نہ پتا ملتا ہے

پڑتی ہے آ کے جان پر آخر بلائے دل:
یا رب کسی بشر کا کسی پر نہ آئے دل

دل بہدفِ تیرِ نگہ پھر کیا تو نے
ہر آنہ ہے سوزِ جدائی سے سرآیا
دل سینہ میں بیتاب ہے جان آ گئی ہے تا بہ لب
دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست
پائی خبر جو آمدِ فصلِ بہار کی
شبِ فراق میں ہم سے تو نالہ کر نہ سکا
پوچھو نہ جلن کا دل کے احوال!
سنا کرو آتشِ گل نے جلا دیا گلشن
گلشن بغیرِ یار ہے کنجِ قفس سے تنگ
ناز و انداز و حسن و خوبی میں
خود بخود دل مرا افسردہ ہوا جاتا ہے
دل کو کس کس طرح بہلاتا ہوں میں
ہجر کی شب گردشیں کیونکر نہ لوں
آشیاں کنجِ قفس میں نہ کبھی یاد آیا
پھر بھی بادیہ پیمائی کی پاؤں کو حسرت باقی ہے
مجنوں ہے کہیں کہیں ہے فرہاد
ناداں ہیں جو رکھتے ہیں امید کسی سے
کبھی خوفِ خزاں ہے اور کبھی صیاد کا دھڑکا
درد و غم و یاس و داغِ حرماں
دو دن کی حیات میں فلک سے
لب خشک ہیں ہمارے منہ زرد ہو گیا ہے -

اگلے ہی مرے زخمِ جگر تھے ابھی آ لے !!
دیکھے تو کلیجے کے دکھاؤں تجھے چھالے
اب جان کو رو کے کوئی یا دل کو سنبھالے
ٹوٹیں یہ پاؤں تھکو تو آ کر کہاں تھکے
کیا پھڑپھڑا کے مرغ گرفتار رہ گئے
وہ کون لوگ ہیں جو ضبطِ آہ کرتے ہیں
اک آگ بڑی دھک رہی ہے !
جل کر خاک ہوا آشیاں نہیں معلوم
ہم تو بڑے عذاب میں اے ہمصفیر ہیں
کون ہے تم سا اس کا نام تو لو
کچھ سمجھ میں نہیں آتا مرا کیا حال ہے آج
پر تصورِ یار کا جاتا نہیں
کوئی پہلو دل کو چین آتا نہیں
بند آنکھیں تھیں جو لیکر مجھے صیاد آیا
جنگل جنگل پھر آیا پھر بھی حسرت باقی ہے
الفت کی عجیب صورتیں ہیں
جز ذاتِ خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا
بناؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں
اک دل ہے ہزار آفتیں ہیں
کیا کیا شکوے شکایتیں ہیں
اب دل نہیں سراپا اک درد ہو گیا ہے

میری طرف سے کوئی صانعِ ازل سے کہے
کھلکھلا کر نہ ہنسو میں نے کہا تھا تم سے
کیا جانیے کیا کیا دلِ عاشق سے گزر گئی
خیالِ یار میں جھپکی نہیں پلک تا صبح
مست کیا جانیں کہاں دیر ہے کعبہ ہے کہاں
آج تک صفحۂ سر انقشا نہیں تجھ سا کھنچا
لطف یہ دارِ گلستاں ہے مجھے یاد ابھی
المدد جوشِ جنوں وقت مددگاری ہے
ہر روز ایک وادی نو سیرگاہ ہے
نہ غرض دین سے نہ دنیا سے سروکار مجھے
رقص کے معنی کھلے اس بت کو رقصاں دیکھ کر
کر دیے ہیں آل نے بھی پیدا خواص شیشے کے
کھنچے چل کے ذرا عالمِ وحشت کی بھی سیر
دن تو عمر کے کرتا ہوں میں اس لیے بسر
روئے رنگیں عرق فشاں ہے
فصلِ گل ہے کہ کو چلا ہے میں مے فروش
پوچھتے رند سے کیا ہو سببِ مدہوشی
رند حاضر ہے شیشہ و ساغر
گل کھلے بادہ چھلکنے لگے پیمانوں سے
تو نے کیمیائے آتش حل کردہ پلا دی ساقی
دردِ دل دور کیے ساغرِ مے کی تاثیر

بگاڑتا ہے جو مجھ کو بنائے گا پھر کیا
قہقہہ سیکھ لیا کبکِ دری نے دیکھو
ہر بار کی شوخی ترے بے ساختہ پن کی
تمام رات میں جاگا ہوں خواب گئے - نے
عمر ساری تری بھٹی پہ گزاری ساقی
خوب صورت ہے ترا صانعِ ایجاد ابھی
دل قفس میں نہیں لگتا مرا صیاد ابھی
سلسلہ چھٹتا ہے زنجیر کا دیوانوں سے
وحشت دکھا رہی ہے بیاباں نئے نئے
یاد میں تیری دو عالم کو فراموش کیا
نازکی رفتار کا رکھا ہے اس نے تمام تر
ذرا سی ٹھیس میں بس چور چور ہوتا ہے
بیڑی کٹ جائے اگر پاؤں سے دیوانے کی
جھیلنا ہے ابھی آفت شبِ تنہائی کی
شبنم گل سے ٹپک رہی ہے
بادۂ رنگیں بیادِ ساقیٔ کوثر نوش
چشمِ مخمور نے اک مست کو بیہوش کیا
مے نہ سمجھو اگر حرام تو لو !!
مست پھر نکلے بہکتے ہوئے میخانوں سے
بھون ڈالا ہے جگر آگ لگا دی مراتی
تیرے ہی ہاتھ سے اللہ شفا دے ساقی

میر وزیر علی صبا

تعارف: ولادت معلوم نہیں، ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کے انتقال ہوا۔ آتش کے مشہور شاگرد تھے۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے دو سو اور محسن الدولہ کے یہاں سے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ ایک دیوان (غنچۂ آرزو) یادگار چھوڑا۔ صنعتوں کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھتے تھے خود کہتے ہیں:

اے صبا آپ رعایت نہ کریں لفظوں کی
زر گل پایا جو گلچیں نے تو کیا مایہ ہوا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اللہ رے ان کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے
کیونکر کوئی جئے گا جب یوں عتاب ہوگا

جائے عبرت ہے جہاں بے ثبات
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا!

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں
وہ دن گزر گئے وہ زمانہ گزر گیا

نہ کہئے نالۂ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر
سنی ہے تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آئے ہیں دم نزع وہ اغیار کو لیکر
کیا کہئے کہ کچھ کہنے کا ہنگام نہیں ہے

اک رشتۂ جاں سیکڑوں پھندوں میں پھنسا ہے
دنیا کے بکھیڑوں سے فراغت نہیں ہوتی

آئی بہار ہوتے ہیں دیوانے سنگسار
لڑکوں کی جھولیوں میں ہیں پتھر بھرے ہوئے

وہ زمیں پر قدم نہیں رکھتے
حسن کا کیا غرور ہوتا ہے

اے صبا جب بہار آتی ہے
ہم کو سودا ضرور ہوتا ہے

آغاز عشق ہی میں ہمیں موت آگئی
آگاہ بھی نہ حال سے وہ بے خبر ہوا

یہ جوانی تو عجب سر پہ قیامت لائی
یاد ایام کہ گزرا ہے لڑکپن کیسا

لے اڑا تجھ کو ترا حسن شباب
اب تو عالم ہی نرالا ہو گیا

عازم دشت جنوں ہو کے میں گھر سے نکلا
پھر بہار آئی قدم پھیرنے سر سے اٹھا

نادان ہیں یہ جو کہتے ہیں امید کسی سے
جز ذات خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا

اٹھ کے پہلو سے کدھر آپ ہیں جانے والے
جگر و دل ہیں تڑپ کر نکل آنے والے

آپ اپنی بے وفائی دیکھئے
ہم سے اور اتنی برائی دیکھئے!

ذکر رقیب عاشق شیدا کے سامنے
اچھی نہیں یہ آپ کی تقریر دیکھئے

دیکھا نہیں ہے طور نگاہِ حضور کا
ہو جائیگا کوئی ہدف تیر دیکھئے

پیادہ پا میں رواں سوئے لالہ زار ہوا
بہار آتے ہی سر پر جنوں سوار ہوا

مثل حباب بحر جہاں میں نہ دم لیا
اک موج تھا کہ میں ادھر آیا ادھر گیا

کسی کے وعدے کا وہ دھیان آ گیا ہو
اٹک اٹک کے نکلتی ہے انتظار میں روح

سو بار مجھ پہ ہجر میں صدمہ گزر گیا
اب تک نہ آیا خیر مرا نامہ بر گیا

تو عدم کے کروں نگاہ میں نقشہ جہاں کا
اب کی عدم کی سمت سے آنا اگر ہوا

نہ روز حشر بھی جب اپنی داد کو پہنچا
خدا کے سامنے اس بت سے شرمسار ہوا

جنوں کا ولولہ موقوف ہے سیر بیاباں پہ
ابھی چھت پھٹے سقف فلک کے لیلائے زنداں پر

وہ حال دل کا ہے جو صبا ہم بیاں کریں
اللہ جانتا ہے بتوں کو یقیں نہ ہو

کبھی خزاں کبھی فصل بہار میں گزری
کب ایک سی چمن روزگار میں گزری

بتوں کے عشق میں مجھ کو ہلاک کر ڈالا
یہ کیا مشیت پروردگار میں گزری

جنوں کا داغ لگا گھر چھٹا اسیر ہوئے
ہزار طرح کی آفت بہار میں گزری

مثال دیر بھری ہیں بتوں کی تصویریں
الٰہی قصر دل خانما خراب گرے

تا روز حشر یاد رہے گا یہ سانحہ
نکلی ہے جان ہجر کی شب کس عذاب سے

کبھی رسائی آہ جبکہ نہیں ہوتی
ہمارے دل کی انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی

درازی شب تار لحد معاذ اللہ
بغیر صبح قیامت سحر نہیں ہوتی

فراق یار میں دیکھے جسے وہ ناصح ہے
تسلی دل غمگیں مگر نہیں ہوتی

عجب نہیں مرے مرنے پہ آپ کا ہنسنا
کسی کے دل کی کسی کو خبر نہیں ہوتی

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مشت خاک کے

آدمی دعوئے انا الحق کا کرے
ولولے دیکھ تو وحشتِ خاک کے

توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو
کھول دے پر طائرِ ادراک کے

مساجد سے زیادہ صفتِ جنت کا جو واعظ
اٹھے مسجد سے اور کوئی بتِ بے پیرہن آئے

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے
جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے

شبِ فراق سے بچ جائیں گے تو جانیں گے
کچھ اور زندگیٔ مستعار باقی ہے

ہزار بار قیامت گذر گئی ہم پہ
مگر ہنوز شبِ انتظار باقی ہے

شبِ فراق میں تا صبح دیکھئے کیا ہو
ابھی تو رات دلِ بیقرار باقی ہے

کسی کو دیکھ کے قابو میں جی نہیں رہتا
یہ روگ آج تک اے جانِ زار باقی ہے

ہرگز نہ کوئی ملک عدم سے پھر آئے گا
عالم اگر یہی ہے یہاں خراب کا

داغ چمکا چلی نسیمِ بہار !
یہ ہوا میں چراغ کس کا ہے

کہتے ہیں سب ترے رخ پہ نور کیلئے
زیبا تھا یہ چراغ سرِ طور کے لئے

ہلتا ہے عرش نالۂ بے اختیار سے
اتنی تو بات ہے دلِ رنجور کیلئے

بنت العنب پہ کچھ بھی توجہ نہ کی مگر
زاہد یہ جی سے مر رہا حور کیلئے

ہم عاشقوں کی خوبیٔ تقدیر دیکھئے
آپ اپنی آئینہ میں تو تصویر دیکھئے

تیرے شبِ چہاردہ ہم کے بناؤ سے
دو دن میں ماہتاب کا چہرہ اتر گیا

فکر رکھتے نہیں ہیں دیوانے
باعثِ غم شعور ہوتا ہے

ہم نہیں مجبور آپ ہیں مختار
کہئے کس سے قصور ہوتا ہے

گر محبت کا دل میں داغ نہیں
خانۂ کعبہ میں چراغ نہیں !

کس دن شبِ غم جان کو آفت نہیں ہوتی
کب شام سے یاں صبح قیامت نہیں ہوتی

اللہ ہمیں عشق کے پھندے سے نکالے
دم توڑ لیے ہیں قطعِ محبت نہیں ہوتی

خدا کا قہر بتوں کا عتاب سہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب سہتا ہے

نہیں ہے اہلِ ہوس کیلئے حلاوتِ عشق
نصیب موردِ مگس شکر نہیں ہوتی

کس طرح ہجرِ صنم میں کوئی دل کو سمجھائے
یہ کہاں سے کوئی پتھر کا کلیجہ لائے

دل لگانا عذاب ہوتا ہے
آدمی کیا خراب ہوتا ہے

میخانۂ عالم میں غنیمت ہے مرا دم
اتنا بھی کوئی رندِ مے آشام نہیں ہے

جو دیکھے گا اس کو وہ اسی کی ہی کہے گا
تیرا کوئی اے دل نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

ملا دی خاک میں میری جوانی !
خدا سمجھے بتِ بیداد گر سے

شوقِ دیدار میں طاقت نہیں گویائی کی
حالتِ دل کا اشارہ نہیں بیاں ہوتا ہے

مجرمِ عشق ترحم کا سزاوار نہیں
ہائے کس پاس سے ہر سو نگراں ہوتا ہے

اس آفتاب کا جو کبھی سامنا ہوا
مہتاب چھٹ گئی رخِ ماہِ تمام پہ

دمِ آغازِ جنوں طوق گلو گیر ہوا
غل مچانے بھی نہ پائے تھے کہ صیاد آیا

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا ابھی میلا ہو کر

قدِ قیامت کا ملا چال بلا کی پائی
آفتیں ڈھائیں نہ یہ فتنۂ دوراں کیونکر

ہم کو تو مل کے حسینوں سے بہت رنج ہوئے
خوش رہا کرتے تھے پریوں میں سلیماں کیونکر

جا کے مسجد کی طرف اس بتِ غارت گر نے
لوٹ لی زاہدوں کی دولتِ ایماں کیونکر

حسین کوئی نظر آیا ہوا میں آپے باہر
دل بیتاب ہے سینہ میں یا پارہ ہے معدن میں

یہ نشاں ہے مزارِ عاشق کا !
چادرِ گل نہیں چراغ نہیں

اٹھے خرامِ ناز کو وہ دھوم پڑ گئی
فتنہ بپا ہوا ہے قیامت کہیں نہ ہو

چھپا رکھے کس طرح مرہم لگائے کس طرح
کیا کرے وہ جس کے دل میں عشق کا ناسور ہو

کچھ اثر آہ میں جو پیدا ہو !
قہر ہو جائے حشر برپا ہو

خاموشی میں مول سے وہ رہا کرتی ہیں باتیں
گویا کہ زباں سے ہمیں کچھ کام نہیں ہے

واعظوں سے کوئی تعریف سنے حور و پری
مسجدوں میں تو قیامت کا بیاں ہوتا ہے

نہ زندگی میں مزا ہے نہ صورت بسمل
چھٹی جو روح بدن سے تو پھر قرار آیا

رہ اردی میں جوانی کا کچھ مزا نہ ملا
مثال فصل کی طرح چاندنی شباب آیا

بہار رنگ میں اس شوخ کا جلوہ نظر آیا
خورشید کے مانند وہ ہر جا نظر آیا

جب یار کو دیکھا نگہ دیدۂ دل سے
قطرہ نظر آیا تو وہ دریا نظر آیا

پرتو سے ترے دیکھتا ہوں صورت عالم
تو روشنی دیدۂ بینا نظر آیا

وہ رنگ ہے تیرا کہ ہے رنگ کے آگے
جس رنگ کو دیکھا تو وہ پھیکا نظر آیا

آنسو بھرے ہیں آنکھ میں گرتے نہیں مگر
آخر چھلک چھلک کے یہ پیمانہ رہ گیا

اس حد جب ہوش اڑا دیے جلوے نے یار کے
اٹھا جو بزم یار سے وہ بے خبر اٹھا

میر سے مرنے کا سبب پھر میں کیا پوچھتے ہو
ختم ہوا وعدہ ہوا درد کا درماں نہ ہوا

منہ محشر میں بھی کیا دکھلائے گا
پھیر میں اور کبھی شرمائے گا

فرقت میں اجل کا سا سماں ہے
یہ وقت ہے سخت بے کسی کا!

سہے داغ سے آہ وہ عاشق
تمغہ ہے عشق و عاشقی کا

چین دم بھر نہ مجھے صورت بسمل آیا
آگیا منہ کو کلیجہ جو کہیں دل آیا

دل نہ قابو میں رہا متصل پہلوئے یار
ناؤ ڈوبی میرے نزدیک جو ساحل آیا

دل گزر گاہ خیال بت زیبا نکلا
کعبہ جس کو سمجھتے تھے ہم وہ کلیسا نکلا

نہ مجھ سا بلبل شوریدہ سر پیدا
نہ تجھ سا گل چمن روزگار میں آیا

راز دل کیا کہوں کاغذ ہے یہ فرشتے ہیں گواہ
کہیں شمع تجھے ملتا نہیں تنہائی کا

خط تقدیر کا شکوہ ہے عبث
اس نوشتہ کا ہے بیکار جواب

بسر کی عصیاں میں ہوتے پردہ دل نگاہ کر
الٰہی توبہ الٰہی توبہ گنہ کیے ہیں چھپا چھپا کر

اللہ رے اضطراب دل بیقرار کا
مر مر کے صبح کی ہے شب انتظار میں

کیا کشمکش میں عشق نے ڈالا ہے کیا کروں
یاں اختیار میں نہ اجل اختیار میں

بزم بتاں میں چھوڑ دیا دل کو بے خطر
شیشہ کو ہم نے پھینک دیا کوہسار میں

زندگانی کا سبب عاشق کی ہجر یار ہے
زیست پروانے کی وصل شمع محفل میں نہیں

ہو نہیں سکتا ہے محو میں نظر باز نگاہ
کور باطن میں جو ترے طالب دیدار ہیں

جوانی میں بڑھاپے میں دل بے غم نہیں گزرا
بہار زندگی کا لطف ملتا ہے لڑکپن میں

ہوں بندۂ عشق بتاں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
مذہب ہی جدا ہے الفت کا یاں کفر نہیں اسلام نہیں

فصل گل آئی کہ معشوق سے توبہ کی ہے
اس خطا پر میں خجل ہوتا ہوں کیا کیا دل میں

چشم دل سے جو یار کو دیکھے
پھر کوئی بیچ میں حجاب نہیں!

خاکسار دل ہی سے منزل کا پتہ ملتا ہے
نقش پا رہبر دل کو راہ نما ہوتے ہیں

ہر موسم گل میں طوق و زنجیر
توبہ کی طرح سے ٹوٹتے ہیں

زباں داں محبت بزم عالم میں نہیں کوئی
سناتا ورنہ حسن و عشق کی داستاں برسوں

ہجر میں موت ہے حیات کے دن
نظر آتے نہیں نجات کے دن

ہم حسن چھپا لیا طور نہ تجلی کی داستاں
اے بت نقاب رخ نہ اٹھا یا جلال میں

روز الست سے ہے وہ میرے خیال میں
اللہ کب سے محو ہوں شوق وصال میں

عقدہ نیاز و ناز کا ہرگز نہ حل ہوا
آیا نہ حسن و عشق کا قصہ خیال میں

پھر وہی طول شب ہجر نظر آتا ہے
پھر وہی ہے مجھے دھڑکا کہ سحر ہو کہ نہ ہو

تم سنو یا نہ سنو نالے کیے جاؤں گا
درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو

جمال حور کا مٹی کی مورتوں کو دیا
کمال صنعت پروردگار کو دیکھو

جگر شق ہو گیا داغ جگر سے
یہ ٹہنی پھٹ پڑی بار ثمر سے

نہ دیکھا ایک دن بھی پھر کے دن کو
رہا دستور سا اپنی بھی نظر سے

الٰہی روز کا رونا کہاں تک
کلیجہ منہ کو آیا چشم تر سے

نہ موافق کبھی طبع بت بے پیر ہوئی
شب تو مر مر کے سحر کی غم تنہائی سے
اپنے نالوں سے گلستاں میں ہوا باندھتے ہیں ہم
دیں گے ہم عشق جوانی کو بڑھاپے میں فروغ
ہوتے ہیں ہشیار جو حیراں ہیں ازل سے
بدلے یہ گلستان جہاں رنگ ہزاروں
معلوم ہوا جامہ صد چاک سے گل کے
پیدا ہزار رنگ ہیں نیرنگ حسن سے
کچھ رنگ ڈھنگ جوش جنوں کہہ نہیں سکتے
ذرے کہہ سکتے نہیں حسن کی شان آئی ہو بہار
ہوا شباب مرا شیب کیا قیامت ہے
یہ رہائی سے گرفتاری میں پایا ہے مزا
رہائی قفس گردوں سے پائی قبر میں جا کر
کیا بتاؤں میں تجلی کا وہ کہیں شوخ کی
کچھ نہ پوچھو بتا نہیں سکتا
آسمان و زمین شکنجہ ہے
دل ہی دل میں گفتگو رہتی ہے باہم روز و شب
جوانی میں جو بڑھاپے میں دل ہے غم نہیں ملتا
سلیماں جانتے ہیں شمع قندیل حرم تجھ کو
ایڑیاں ہجر کی ایذا میں کہاں تک رگڑوں
زاہد ہی ڈرتے نہیں دیکھتے اس کی جا

یہ بھی ہمیں لئے گویا میری تقدیر ہوئی
دیکھئے ہجر کا دن کیا مجھے دکھلاتا ہے
ایک دن تو وصل مرغ چمن دیکھیں گے
جو ہر تشنہ صہبا کے کہیں دیکھیں گے
آئینہ کی حیرت کسی صورت ہی نہیں جاتی
خوشبوئے گل داغ محبت نہیں جاتی
کپڑے بھی پھٹے ہوں تو شرافت نہیں جاتی
گلدستہ بہار ہے تصویر یار کی
گذرے الٰہی خیر سے مدت بہار کی
منھ کو تکتے ہیں اسیران قفس صیاد کے
تری بہار کو دیکھیں مری خزاں دیکھیں
پڑھتے نہیں کلمہ اسیران قفس صبا کا
نکالا ہے زمیں کو کھود کے دروازہ زنداں کا
ہوش آئے کس طرح سے بے خبر کیوں کر ہو
کس سے چھوٹا ہوں کیا نہیں ملتا
چین اس میں ذرا نہیں ملتا
میرے اس کے درمیاں تقریر کی حاجت نہیں
بہار زندگی کا لطف ملتا ہے لڑکپن میں
چراغ دیر ہے تو اے صنم چشم برہمن میں
یا الٰہی مری مشکل کبھی ہو آسان کہیں
کر تلف منت میں ہو جائے نہ ایماں کہیں

میر سادات حسین عرف آغا حجو تخلص شرف

آتش کے شاگرد واجد علی شاہ کے مصاحب اور ہمدم تھے ان پڑھ تھے مگر کلام اغلاط سے پاک اور پختہ ہے ان کا ایک خاص رنگ ہے دیر و بتکدہ ، صنم و برہمن ناقوس و قشقہ زنار و تسبیح زاہد و مصلی سبو و خم واعظ و شیخ و میخانہ و شیشہ و ساغر و ساقی و پیر مغاں جام و صراحی کا ذکر نہیں آنے پاتا تھا کہتے تھے کہ جن شعروں میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں ان سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے راجہ امیر حسن خاں صاحب (محمود آباد) نے ان کا دیوان چھپوا دیا ہے مجھے دیوان نہیں ملا تذکروں سے اشعار نقل کئے ہیں اگر دیوان مل جاتا تو انتخاب کچھ اور ہوتا۔

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
منزل عشق کا حال آپ ہی آؤں تو کہوں
کون ہے جس سے فسانہ کہوں دل تیرا
پوچھتے کیا ہو حقیقت مری بیتابی کی
پھڑک کے جان نہ دیتا تو وہ کیا کرتا
چہار سمت مجھے تو ہی تو نظر آیا
اے شرر دامن ہستی کا مزا اچھا تجھ کو
شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی ہو گئی
وا لیے تقدیر ہم جب پہنچے حرم یار میں
مٹے گا خاک یہ اک دن طلسم دنیا کا
بے نیازی یہ انھیں ناز مرے دم تک تھا
داغ ہجراں جگر و دل میں نہاں رکھتے ہیں
کام عمر نہ بیٹھے کہیں ٹھکانے سے

صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا
دم ذرا لینے دو میں دل کو سنبھالوں تو کہوں
سننے والا کوئی پہلو میں بٹھالوں تو کہوں
آؤ میں تم کو کلیجہ سے لگالوں تو کہوں
قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا
اٹھا کے آنکھ جدھر اشتیاق میں دیکھا
دل دیا اس کو جسے پیار کے قابل سمجھا
بھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا
شمعیں سب گل ہو چکی تھیں ہم تیرے دالان میں
یہ کارخانہ ہے مشت غبار سے پیدا
لن ترانی کی نہ پھر آئی صدا میرے بعد
آپ کا حسن نہیں تم جو چھپا ہی دیکھیں
لے پھری ہیں دن رات جستجو تری

تجھے دل دیکے میں نے آزمایا !
وہ سیکھا جس نے کچھ کھویا ہے پیارے

جنبش ہوئی مژہ کو تو برہم ہوئے دو کون
آہو سے چشم یار کی یہ ایک جہت ہے

تجھے مجھ تو لطف دیدہ تر دل بھی آ پھنسا
مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

جوہر تیغ نگہ کھل جائے گا
منہ نہ میرے زخم کا کھلوا دیجئے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل ایک دن جھونکا کھائے گی

کچھ تو ہوگا بحر یا انجام کار
بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائے گی

دل سے ہر دم ہوا آواز کہ الٰہی
بند آنکھوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

دوزخ و جنت ہے اب میری نظر کے سامنے
گھر رقیبوں نے بنایا اس کے گھر کے سامنے

خواب میں شب کو خیال آیا تھا جنت کا ہمیں
صبح دیکھا تو پڑے ہیں تیرے در کے سامنے

نظارہ بازی سے آنکھیں تو پائیں تسکین
تسلی دل کی امیدوار باقی ہے !

نام پر حرف نہ آنے دیجئے
جان اگر جائے تو جانے دیجئے

کیوں خفا رشک حور ہوتا ہے
آدمی سے قصور ہوتا ہے

ایک اقلیم میں دو شاہ نہیں رہ سکتے
عشق جب آیا تو آرام کہاں رہتا ہے

جو جیب ہوں تو جنوں دل آتش کھاتا ہے
خزاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے

سیر بیاباں چاک گریباں !
وہ پائے خردی یہ دسترس ہے

صبر رخصت ہو تو جانے دیجئے
بیقراری آئے تو ٹھہرا دیجئے !

نام پر حرف نہ آنے دیجئے
جان اگر جائے تو جانے دیجئے

ٹکڑے جگر کے آنکھ سے باہر نکل گئے
ارمان آج دل کے ہمارے نکل گئے

بیدار ہیں بخت خفتہ سحر
یارب آنکھوں کو خواب دیدے

مجھ سے پہلے کوئی اس شوخ پہ کب مرتا تھا
ملک الموت ہوا میری قضا سے پیدا !

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے
یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

شب جو آیا بزم میں وہ شعلہ رو
شمع گل کرنے کو پروانہ جلا

صہبا کشوں کی خاک ہے ہر ایک قدم پر
ساقی لنڈھا شراب کہ مستوں کے نام پر

دیوانہ باش تا غم تو دیگران خورند
واللہ ہوشیار ہے وہ جو کہ مست ہے

کچھ خبر ہے شب دراز فراق
چاک پیراہن سحر کیوں ہے

عشق کے زینے کے آگے آسماں بھی پست ہے
سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

خم نہ بن کر خود غرض بن جائیے
مثل ساغر اور کے کام آئیے

ابر رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے

اب آپ چشم میں آہو نہیں
ہم سے وحشت کی سیکھئے آئیے

دل لگا کر اس نے ٹھانی جی میں دشمنی
بڑھ کے ہو جاتی ہے آخر دل لگی میں دشمنی

طوفان نوح اس میں ہو یا شور حشر ہو
ہونا جو ہے وہ ہوگا جو گزرا گزر گیا

بے دل جو مجھ کو پایا تو بولا خیال یار
مہماں بلا کے صاحب خانہ کدھر گیا

کس سوچ میں ہو نسیم بولو !
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

زنجیر جنوں کڑی پڑے گی !
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

آتا ہو تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے

لگی ہو گئی چراغ سحری لے بلبل
ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صدا آتی ہے

آغا حسن امانت
شاگرد دلگیر

تعارف: سنہ ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۷۵ھ میں انتقال ہوا۔ لفظی رعایت میں مشہور ہیں اور اکثر بے ڈھنگا پن پیدا ہو گیا لوگ اسی کو انکا امتیاز سمجھتے ہیں اور ایسے ہی اشعار پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کے یہاں اچھے شعر بھی ہیں آج ہم آپ کو ان کے اچھے شعر سناتے ہیں ؎

روح کو راہِ عدم میں مرا تن یاد آیا — دشتِ غربت میں مسافر کو وطن یاد آیا
جیسے پھول گئے رخ و حسن یاد آیا — رو دیا میں نے قفس میں جو چمن یاد آیا
برگِ گل دیکھ کے آنکھوں میں ترے بھر گئے لب — غنچہ چٹکا تو ترا لطفِ سخن یاد آیا
آہ کیوں کھینچ کے آنکھوں میں بھر آئے آنسو — کیا قفس میں تجھے اے مرغِ چمن یاد آیا
بتوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا — یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا
گلشنِ دہر میں لاکھ آئی برس دن میں بہار — اس سبکروح کو بھاری ہوئی منزل کیسی

وہ بت مجھ سے ناحق خفا ہو گیا — خداوندِ عالم یہ کیا ہو گیا!
نکالی غنچہ نے بات اس کے مسکرانے کی — ہنسی ہنسی میں یہ مجھ کو رلا کے پھر کیا
ہے فصلِ بہاری میں یہ صیاد کا دھڑکا — دل اڑ گیا بلبل کا جو پتہ کہیں کھڑکا
روشن دلوں کو بادِ حوادث سے کیا گزند — صرصر سے گل ہوا نہ چراغ آفتاب کا
کون تھا بارِ غمِ عشق اٹھانے والا — مجھ کو پیدا جو نہ کرتا تو خدا کیا کرتا
لطف اب زیست کا اے گردشِ ایام نہیں — مے نہیں یار نہیں شیشہ نہیں جام نہیں
فریاد ہجر میں نہ کبھی عمر بھر کریں — مر جائیں بھی تو ہم نہ کسی کو خبر کریں
فصلِ گل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو — ساقی مہوش ہو مے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو
بزمِ عالم کے حسینوں میں عجب اندھیر ہے — جان دیں پروانے اور شمع کو پروانہ ہو

یک بیک شب کو جو وہ رشکِ قمر آ نکلا — چاندنی کھل گئی نور آ گیا سارے گھر میں
کر سبک تن کو مرے مثلِ حباب اے غمِ یار — روح کہتی ہے کہ پوشاک بہت بھاری ہے
بچا لیجئے گا بات مری مان لیجئے — میں جان دوں گا آپ پہ یہ جان لیجئے
لب خشک چشم تر ہے زباں لال چہرہ زرد — عاشق کو شکل دیکھ کے پہچان لیجئے
ہرگز لگائیے نہ امانت بتوں سے دل — کہنا مرا خدا کے لئے مان لیجئے
کس کے نالوں نے کیا بزم کو روشن مطرب — آج کیوں شعلۂ آواز ترا مدھم ہے
دورِ ساغر میں نظر آتی ہے ساری دنیا — جم گیا جام کا جب رنگ تو ساقی جم ہے
بہار آئی ہے گلشن میں گھٹا جاتا ہے دم اپنا — قفس کے در کو وا کرتا نہیں صیاد کیا کیجے
دل مرا سیرِ چمن سے نہ ہوا شاد کبھی — لے گیا باغ میں کمبخت نہ صیاد کبھی
بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز — ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی
وہ دم حسینوں کا بھرتا ہے ہو چکی مری زیست — جو خود مریگا کسی کو جلائیگا پھر کیا
خط ان کا دیکے مجھ کو نامہ بر نے دی اک گالی — کہا میں نے یہ کیا بولا کہ پیغام زبانی ہے

تا لئے بنا کے سر پہ رکھے آسماں نے — ذرے جو تیرے آ گئے ہو تیرے نقشِ پا کے ساتھ
آئی بہار ساقیا جام شراب دے پلا — پھول کھلے کھلے شجر ابر اٹھا چلی ہوا
انگلی بہار کے لئے اے پنجۂ جنوں — دو چار تار ہم نے گریباں میں رکھ لئے
جو غرق ہوا پھر نہ لگا اس کا ٹھکانا — ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے
مرتا ہوں تیرے ہجر میں اے یار خبر لے — اب جان لئے جاتا ہے یہ بیمار خبر لے
کس غم کو ہم اس دل پہ گوارا نہیں کرتے — شکوہ ترا اے ستم آرا نہیں کرتے
لطفِ یار ایک گھڑی ہجر کا برسوں غم ہے — فرصتِ عیش زمانے میں نہایت کم ہے
اللہ رے ہجومِ گل و جوشِ بہار — ملتا نہیں ہے مجھ کو مرا آشیاں مجھے
تیری بھوؤں میں بل پڑا قتل ہوا میں تیغ سے — تیری ادھر پلک جھپی میرے ادھر چلی چھری

عریاں رہا جنوں میں مرا ہر طرح بدن
دامن رفو ہوا تو گریباں نکل گیا

ڈھونڈھتا ہے رخ جاناں کو مرا دل کیا کیا
داغ دیتا ہے فروغ مہ کامل کیا کیا

کسی کے غم نے رلایا مگر امانت کو
کہ آج گھر سے چشم پر آب نکلا ہے

جو غرق ہوا پھر نہ نکلا اس کا ٹھکانا
ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے

کہہ دو ظالم سے کہ عاشق کو گوارا ہے ستم
میرے ہوتے نہ کسی اور پہ بیداد کیجے

جس نے نظارہ کیا اصل علی یاد آیا
تیرے حلقے میں صنم حسن خداداد آیا

بن میں جو آیا وہ رشک بہار
تو رنگ رخ گل ہوا ہو گیا

مرا وصال صنم کا اٹھائیگا پھر گیا
ذرا جو ہجر سے وہ دل لگائیگا پھر گیا

رخ جاناں پہ نظر کر کے بندھا گل کا خیال
قد کو دیکھا تو مجھے سرو چمن یاد آیا

زمزمہ کس کی زباں پہ بدل شاد آیا
منہ نہ کھولا تھا کہ پر باندھنے صیاد آیا

ہو گئی قطع اسیری میں امید پرواز
اڑ گئے ہوش جو پر باندھنے صیاد آیا

بجھ جائے محتسب کی جو شمع حیا تو کل
میخانہ میں چراغ جلاؤں شراب کا

شعلہ ہے یا شرر ہے چھلاوہ ہے یار کا
بجلی چمک گئی وہ جدھر سے نکلے

دل حشر بپا کرتا ہے سر پر پڑے کیا کیا
جو جیسی کی صدا ہے قیامت کی گھڑی ہے

بہار قفس میں پہ صیاد آشنا ہے مزاج
کہ عندلیب کو پانی کی جا گلاب دیا

فصل گل آئی چمن میں کہ قیامت آئی
عندلیبوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

دم خفا ہوتا ہے کیا کیا قفس تنگ میں
دیکھیں اس قید سے کس روز رہا ہوتے ہیں

ہجر میں دل پہ امڈتا ہے وہ غم کا دریا
شب کو نالے مرے سوتوں کو جگا دیتے ہیں

رنگ جتا نہیں لالے کا پھرائے غیرت گل
ہوا چمن میں جو تجھے منہ قبا ہوتے ہیں

وطن آواروں کی آنکھوں میں پھر آئے آنسو
ملے نہ کسی پاس خم وقت سفر کی

سید مظفر علی اسیر

تعارف:۔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۲ء میں انتقال ہوا مصحفی کے شاگرد تھے مگر ۱۰ برس کا سن تھا کہ مصحفی کا انتقال ہو گیا اس عمر میں انہوں نے کیا حاصل کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں جو پختگی ہے وہ ان کی ذاتی صلاحیت کا نتیجہ ہے ان کا کلام ناسخ سے متاثر ہے۔ ~

ہجر بیمار ہوئے رشک مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

مسجد سے نکل کر ہیں رہ بیت کدہ بھولا
تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا

اٹھنا انھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے
حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپش دل

ہیں اور زیست بھر میں قدرت خدا کی ہے
انسان کے اختیار میں ہی اجل نہیں

باقی رہی ہے ترک تمنا کی آرزو
کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آتی شب ہجر
اے فلک کوئی تو امید بر آئی ہوتی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

دیکھے اسیر مکاں پھر نہ ملے گھر اپنا
قدم آگے نہ بڑھانا ہمارا ویرانے سے

وہ صنم تو ہے کہ نکلا جو کبھی جانب دیر
بت نکل آئے تماشے کو صنم خانے سے

نہ بیاباں ہے نہ وہاں پوچھنے والا کوئی
کون ہشیار ہے بڑھ کر ترے دیوانے سے

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا
کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

سن کے باتیں اس کی پردے سے مجھے غش آ گیا
شعلہ آواز برق لن ترانی ہو گیا

کچھ تو الفت کی ترے کوچہ کی بو آتی ہے
گرد اٹھ کر مرے دامن سے لپٹ جاتی ہے

ٹوٹ جائے نہ رہا نہ کہیں توبہ رے
موجیں اٹھتی ہیں طبیعت مری لہراتی ہے

نہ نکلے وقت عزیزوں کو صحبت کبھی
ہو چکی ختم کہانی ہمیں نیند آتی ہے

ہر خاکسار صاحب توقیر ہو گیا !　　پارہ ہوا جو خاک تو اکسیر ہو گیا

سیر چمن نہ کی تھی کہ نخچیر ہو گیا　　نکلے جو بال و پر ہدف تیر ہو گیا

حیرت ہوئی یہ اس کے نظارے سے خلق کو　　عالم تمام عالم تصویر ہو گیا

رہا ہے یاد ابرو میں مجھے شغل فغاں برسوں　　وہ مومن ہوں کہ دی ہیں کعبے میں اذاں برسوں

صیاد واقف ہو نہیں کبھی پتے پتے بوٹے بوٹے سے　　ہمارا بھی رہا ہے اس چمن میں آشیاں برسوں

مزا عشق جوانی کا کوئی جانتا ہے پیری میں　　جو زخم اچھا کبھی ہوتا ہے تو رستا ہے برسوں

نہ کعبہ کا نہ ہم سے دیر کا ہے حال پوشیدہ　　پہاڑ ہم نے بھی عمر کاٹی ہے یہاں برسوں

تدبیر جب کوئی نہ چلی وصل یار کی　　انجام کار قائل تقدیر ہو گیا

کی یار نے جو غیر کی جانب نگاہ لطف　　اپنے جگر سے پار ہمارے تیر ہو گیا

قصد لٹنے کا تو تھا اسکو ہمارے پاس سے　　چار آنکھیں ہوتے ہی [illegible] بدل کر رہ گیا

کیسے کیسے گل خزاں کے جور سے مرجھا گئے　　پتہ پتہ اس چمن کا ہاتھ مل کر رہ گیا

نہ کیوں کر اپنی تیار ہو بطبع نفس امارہ　　لباس دوستاں جوانا [illegible]

اللہ رے شوق خط بھی نہ ہم نے کیا تمام　　قاصد کمر کو باندھ کے تیار ہو گیا

الٹے وطن سے شوق ملاقات رہ گیا　　موت آئی جب قریب ہمارا وطن رہا

ہول کا شوق سوے کعبہ لے چلا ہے مجھے　　یہی جو بیچ ہے تو حاکم الٰہ کیا ہوگا

گھڑی گھڑی کی خبر ہم کو دل کو ملتی تھی　　جو خط کا وہ نہ لکھیں گے جواب کیا ہوگا

شب وصلت ملا کو تا پچھے دل کو سخت ایذا　　یہ بڑھ جائیگی جو [illegible] تو تباہ ہو جانا

گھٹا کے بعد کو بھر راہ میں ہلال گیا　　تمہارے چاند سے چہرے نے بھی کمال کیا

گیا ہے تو گدائے در کریم ہو کے　　کیا سوال تو اللہ سے سوال کیا

سجدہ بھی وحشت در یار نہ کر سکے یارب　　لے چلے داغ ترے در سے جبیں سائی کا

ہوں وہ عاشق مجھے سوز غم وقت پسند　　دل ہے پروانہ چراغ شب تنہائی کا

دل مضطر کہیں عاشق کا ٹھہر سکتا ہے　　ماہی نام ہے بس صبر و شکیبائی کا

واہ رے دور فلک خانہ احسان آباد　　چرخ تختہ سر خور کو انگڑائی کا

کب ملی فرصت تڑپنے کی ترے بیمار کو　　کچھ کمی درد جگر نے کی تو درد دل اٹھا

جب تک جیے جہاں میں مر مر کے ہم جیے　　جس خوبرو پہ آنکھ پڑی دم نکل گیا

وصل معشوق میں کچھ رہتی عاشق کی بھی　　قطرہ مل جائیگا دریا میں تو دریا ہوگا

بتکدے کی میں سیر کر آیا !　　واں خدا ہی خدا نظر آیا

ہوں وہ بسمل کہ ہوں میں عاشق درد　　دل بھر آیا جو کوئی زخم جگر بھر آیا

ذرا سی بات میں ہوتے ہیں اپنے بیگانے　　بڑا کمال کسی کو ہے اپنا کر لینا

گردش بخت زبوں جور فلک رنجش یار　　درد لاکھوں ہیں کس کس کا مداوا کرتا

مطلب لا بے طلب ہو جائے گا　　جب خدا چاہے گا سب ہو جائے گا

تو جو خورشید ہے تو میں شبنم　　میں کہاں جب ترا ظہور ہوا

طائر بے بال و پر ہوں کبھی پرواز چمن　　نام ہے بے تابی دل شوخی پرواز کا

بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے بہکر　　جرم اس نے کئے ہیں مجھے غفار سمجھ کر

مرتبہ حسن کا تکلیف میں گھٹتا ہے کہیں　　خوشنما لگتی وہ زلفیں ہیں پریشانی پر

روشن اسی سے محفل آفاق ہے تمام　　رکھتا ہے مثل شمع جو سوز و گداز عشق

مزاج وہ نہ رہا وصل یار کے نزدیک　　جنوں ہوا جو دوا ہے بہار کے نزدیک

ابھی ہے اتنی محبت کہ راہ چلتے ہیں　　ٹھہر ٹھہر کے ہمارے مزار کے نزدیک

فرقت میں شوق وصل تو وصلت میں خوف ہجر　　راحت فراق میں ہے نہ ہم کو وصال میں

تمام سال بلا دشوار ترے کم سے ہے اسیر　　ہر ایک ماہ کو کچھوں کر وہ تمام کر گیا

گلزار کسے کہتے ہیں گل نام ہے کس کا　　صیاد بہار آتی تو ہولی آنکھ قفس میں

پوچھا بھی کسی نے نہ ہمیں روز قیامت　　دوزخ بھی گئی ہاتھ سے جنت کی ہوس میں

نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا کس کو
حسن بے پردہ ہے پر تاب تماشا کس کو

ہو نہیں بیمار محبت مگر اتنا نہیں ہوش
درد کیا چیز ہے کہتے ہیں مداوا کس کو

وہ دل ہی کیا کہ جو ہو داغِ عشق سے خالی
اسیر خانۂ دشمن بھی بے چراغ نہ ہو

حالِ دل قابلِ تماشا ہے !
تم جو دیکھو تو نیا تماشا ہو

عشاق اور تاب تماشائے روئے یار
چمکی جو برق طور غش آیا کلیم کو

کہتی ہے قیامت میں یہ وحشت دل مجھ سے
دوزخ میں چلو جب تک آراستہ جنت ہو

چھپتی نہیں ہے اس سے کبھی پیار کی نگاہ
پہچانتا ہے طالب دیدار کی نگاہ

حسن کے طالب نہیں رکھتے تمیز کعبہ و دیر
ایک پروانہ کو شمع کعبہ و میخانہ ہے

دیکھی ہے وقت زیب جو اپنی سی اور شفق
آئینہ کی طرف نظر اشتیاق ہے

کعبہ چلتا ہوں پر اتنا تو بتا
میکدہ ہے کوئی زاہد داں نہیں

بک رہا ہے تو مَیں بیٹھا ہوں خموش
تجھ کو اے ناصح ہے یا سودا مجھے

موجود ہم ہیں خاک میں ملنے کو اے اجل
لیکن یہ شرط ہے کہ وہاں آسماں نہ ہو

ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پر دمِ حشر
ناز نے غمزے پہ غمزے نے ادا پر رکھا

بیٹھے ہیں جا کے پہلوئے قاضی میں ترے مست
مسجد کے پاس میکدہ تعمیر ہو گیا

پھولتا پھلتا نخلِ تمنا کس طرح
بچ رہا بجلی سے تو پانی جل کر رہ گیا

پیامِ مرگ تماشائے روئے یار ہوا
چمک کے برق چراغِ سرِ مزار ہوا

تھوڑی سی عمر اور سو یارب مجھے عطا
رہ جائے آسماں کو نہ بیداد کی ہوس

محشر میں کریں گے دعوئے عفو
تحریر خطِ جبیں سند ہے

جدائی دی اگر تو نے تو یہ بھی اے خدا بس
شباب اتنا کہ ہر جائے کہ دل کا حوصلہ نکلے

دھوم محشر میں ہوئی جب تری آمد کی
بے گنہ مل گئے مجھ چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

بے ہوش میں آیا تھا گیا دہر سے بے ہوش
آنے کی خبر مجھ کو نہ جانے کی خبر ہے !

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور

اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آتش کے تلامذہ کا سلسلہ ختم ہو گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ خود آتش عروض و قافیہ سے گہری واقفیت نہیں رکھتے زبان کے بارے میں بھی کچھ ایسے ہی تھے اس وجہ سے ان کا کلام مستند نہیں سمجھا جاتا تھا مگر طرز پسندیدہ تھا۔

ان کے شاگرد بھی ایسے ہی تھے جو عروض و قافیہ سے ربط نہیں رکھتے تھے سوائے نواب سید محمد خان رند کے اور اس زمانہ میں شاعری کے لیے عروض و قافیہ میں مہارت ضروری سمجھی جاتی تھی اس وجہ سے پڑھے لکھے لوگوں نے ناسخ کے سلسلہ کو اختیار کیا جس میں کا ہر ایک عروض و قافیہ معانی بیان اور تحقیق زبان میں مسلّم تھا۔

آتش زبان اور حسن بیان میں ناسخ سے متاثر تھے مگر اپنا رنگ الگ بھی رکھتے تھے۔ اس دور کے شعراء آتش سے بھی متاثر تھے اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور ناسخ و آتش کے رنگ کا گہرا امتزاج ہے۔

یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اسیر کی وجہ سے مصحفی کا سلسلہ قائم رہا مگر یہ صحیح نہیں اوّل تو خود مصحفی ناسخ سے متاثر تھے دوسرے اسیر نے کے دن مصحفی سے فیض حاصل کیا اس لئے مصحفی کا سلسلہ بھی ناسخ ہی کا سلسلہ سمجھنا چاہیئے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مصحفی کا خود کوئی رنگ نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری کہیں کی بھی ہو ناسخ سے متاثر ہے اور ابتک انھیں کی تقلید پاکیزگی کلام کی ضمانت ہے۔

سیّد مرزا تعشق

تعارف:- سید محمد مرزا اُنس شاگرد ناسخ کے بیٹے میر عشق کے چھوٹے بھائی اور شاگرد ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔

شعلۂ حسن سے تھا دود دل اپنا اوّل   آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

برق رہ رہ کے چمکتی ہے تو میں کہتا ہوں   ہو غنیمت اگر اتنا بھی مرا دل ٹھہرے

دل حزیں پہ خدا جانے کیا بلا آئی   عجیب درد سے روتا ہے کوئے دلبر میں

وہ چشم مست ہے ایسی خمار آلودہ   بھری ہو جیسے لبالب شراب ساغر میں

دوستو ہیں نگہ ناز کے روزن دل میں   ورنہ برچھی سے ہیں زخمی نہ کسی تیر سے ہم

وہ تڑپنا دیکھتا ہے کس طرح بسمل ہو سر   رشتۂ نظارۂ قاتل رگ جاں ہو گیا

خوشا دل منعکس ہے جس میں صورت عرش اکبر کی   مرے گھر سے فضا معلوم ہوتی ہے ترے گھر کی

پڑھا جو نزع میں قرآں رہی نہ جسم میں روح   زباں بند ہوئی سن کے گفتگو تیری

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا   کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

یہ اتفاق کبھی دنیا میں کم سنا ہوگا   ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری

مری لحد کو نہیں احتیاج چادر گل   دماغ جاں میں ابھی تک بسی ہے بو تیری

یہ کس نے وعدہ کیا ہے تعشق آنے کا   ہر ایک وقت جو آنکھیں ہیں چار سو تیری

عشق کی وہ شورشیں وہ ولولہ جاتا رہا   اک جوانی کیا گئی سب حوصلہ جاتا رہا

خاک ہو کر شمع و پروانہ ہوئے آپس میں ایک   عشق کامل کے سبب سے فاصلہ جاتا رہا

حال تغیر کیا زلف کے سودائی کا   اب خدا جانے دکھائے شب تنہائی کیا

ہوں تو حرف غلط تقدیر نہیں مٹنے کا   آپ کے در پہ ارادہ ہے جبیں سائی کا

دل پر داغ کا کیا حال کہیں ہم تم سے   پھول دیکھا ہے کہیں لالۂ صحرائی کا

دل جو مر جائے ہمارا تو کرے کون اپنی   سو گیا جاگنے والا شب تنہائی کا

خموشی ہو گئی طوق گلو آج   کسی کی یاد آئی گفتگو آج

سر محفل بھر آئے ہوتے آنسو   گئی ہوتی ہماری آبرو آج

ہوا ترک محبت پہ نہ راضی   رہی تا دیر دل سے گفتگو آج

یہ جیسے نالوں سے تھی تنگ ہجر یار میں روح   کہ بعد مرگ نہ آئی مرے مزار میں روح

ہم اس چمن میں وہ بلبل ہیں جن کا الفت   وداع تن سے ہوئی رخصت بہار میں روح

قدم قدم پہ جنازہ نہ کیوں ٹھہر جائے   کہ میرے جسم سے نکلی ہے انتظار میں روح

ہے احتضار مجھے دوستو تڑپنے دو   اسی طرح سے نکلتی ہے انتظار میں روح

نہ ترک ہوتی ہے الفت تری نہ مرتا ہوں   نہ اختیار میں دل ہے نہ اختیار میں روح

حیات کا ہے تعشق بھلا بھروسہ کیا   ہوا حباب میں ہے یا ہے جسم زار میں روح

ہر طرف شور ہے جھنکار ہے زنجیروں کی   ان کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں

پڑ گئی کیا نگہ مست تری اے ساقی   لڑکھڑاتے ہوئے میخوار چلے آتے ہیں

کبھی نہ ہوش میں ہم اے خیال یار آئے   کسی کے در پہ گئے جب اسے پکار آئے

ہماری خاک پڑی ہے تمہارے کوچہ میں   ذرا نسیم سے کہدو نہ بار بار آئے

ہمارے بعد یہ ہے حال ہمسفروں کا   اس آشیاں میں صدا دی اسے پکار آئے

میں باغ میں ہوں طالب دیدار کسی کا   گل پہ ہے نظر دھیان میں رخسار کسی کا

گر پڑے آنسو عروج ماہ کامل دیکھ کر   میری نظروں میں ترا عہد جوانی پھر گیا

دل ہے مردہ خلد میں اپنے سی کیا ہو جائیگا   ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائیگا

تجھ پہ جراحت دل نازک مزاج کا   ہو ٹوٹنے ہے حصول کے تار نگاہ پر

تلاش شب وصل میں پھر رہا ہوں   مرا آپ دیوانہ ہیں دیکھے حسین

یاد تم دل سے کبھی جاتی نہیں   اب تو بھولے سے ہنسی آتی نہیں

کچھ خبر ملتی نہیں دل کی مجھے   آج نالوں کی صدا آتی نہیں

نہیں تسکین ہوتی ایک جا پر کوئے جاناں میں
سحر سے شام تک ہم سو جگہ بستر لگاتے ہیں

عجب اندھیر کر رکھا ہے آج ان کی نگاہوں نے
جو کل کہتے تھے سرمہ آنکھ میں کیونکر لگاتے ہیں

دوستوں کو ملے ہیں وہ مرے اعضا جو بچے ہیں
دل بیتاب کا دیکھوں پتہ کیونکر لگاتے ہیں

یہ باغ گیا جہاں میں راحت کہیں نہیں
دل مضطرب ہے اس کا ٹھکانا کہیں نہیں

میں زاہدوں کے سامنے ہوں تمہارے قربان الصلوٰۃ
کس سے کہوں کہ لائق سجدہ جبیں نہیں

مشق تصور دل صد پارہ دیکھیے
اتنے حسیں ایک جگہ پر کہیں نہیں

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو دامن بھیگے ہو
یہ کس غریب کی تربیت کے پاس بیٹھے ہو

طوق منت کے گلے میں تھے وہ دن یاد کرو
ہم تیرا اس عہد میں بھی چاک گریباں سمجھے

سنہ جو فرقت میں زرد رہتا ہے
کچھ کلیجے میں درد رہتا ہے

نجد سے جانب لیلیٰ جو ہوا آتی ہے
دل مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

ہم کو مل جاتی ہے اپنے دل وحشی کی خبر
ٹوٹتا ہے کوئی ٹانکا تو صدا آتی ہے

یاد آیا میکدہ تھا زور و شور جذب حسن و عشق
وہ میرے دل کا تڑپنا بے قراری آپ کی

لیجیے روح بھی تڑپنے لگی
دل تو مدت سے اضطراب میں ہے

بیٹھے بیٹھے اپنے دل کی غیر حالت ہو گئی
دوستو جلدی خبر لینا قیامت ہو گئی

اب اگر تخفیف ہوتی ہے تو گھبراتا ہوں میں
درد دل اتنے دنوں سے ہے کہ عادت ہو گئی

کرتے کرتے آہیں روتے روتے آخر مر گیا
آج مجھ کو آپ کے کاموں سے فرصت ہو گئی

پوچھتے کیا ہو شب فرقت کی بیداری کا حال
آنکھ کیونکر بند ہوتی ہے یہ حسرت لے گئے

جب اسیران گذشتہ کی حکایت یاد کی
رات بھر بیٹھا رہا نیند اڑ گئی صیاد کی

باغ کے حسن گذشتہ کا اسیروں سے ہے ذکر
یا الٰہی بند ہو جائے زباں صیاد کی

دیر تک روئی خوشی حسرت سے مجھ کو دیکھ کر
جب بنا ڈالی گئی میرے دل ناشاد کی

وحشیوں میں آمد فصل بہاری کی ہے دھوم
بیڑیاں آواز دیتی ہیں مبارکباد کی

دم نکلنا کوئے جاناں سے نکلنا یاد ہے
ہم یہ دو باتیں نہ بھولے عالم ایجاد کی

ہم خون آرزو کا جو محضر بنائیں گے
تجھ کو گواہ اے دل مضطر بنائیں گے

خلخال ان کے پاؤں کی زرگر بنائیں گے
طوق گلوئے فتنہ محشر بنائیں گے

افتادہ رہنے دی تھی زمیں دل کی اس لیے
امید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے

بنتی ہے روز زلف مشوش کے سامنے
دیوانہ آپ اس کو مقرر بنائیں گے

کسی سے دشت نوردی کی وجہ کیا کہیے
شکایت دل خانہ خراب ہوتی ہے

نہ گھر میں اور نہ آتا ہے اس گلی میں قرار
عجیب مشکل دم اضطراب ہوتی ہے

ایسی دلدوز حسینوں کی پلک ہوتی ہے
سانس لینے سے کلیجہ میں کھٹک ہوتی ہے

ہے یہ نزدیک قدم رنجہ کرے فصل بہار
سر آمادہ سودا میں دھمک ہوتی ہے

سمجھ لیے ہیں چراغ دل تربت میں جانے کیلئے
روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کے لئے

گیا شباب مگر رہ گیا تعلق عشق
دل و جگر میں چمک گاہ گاہ ہوتی ہے

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

یہ اتفاق بھی دنیا میں کم سنا ہوگا
ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری

طبیعت سے یہ کہتا ہوں جنوں کی فصل آ پہنچی
کئی دن سے رگ جاں میں کھٹک معلوم ہوتی ہے نشتر کی

بے وفائی آپ کی غفلت شعاری آپ کی
میرے دل نے عادتیں سیکھیں ہیں ساری آپ کی

یا در رخ دیدۂ پر آب میں ہے
بوئے گل جامۂ حباب میں ہے

پاؤں آہستہ سے رکھ لے غافل
دیکھ تو کون کون خواب میں ہے

ہالہ اترا ہے داغ سے سجا پایا
تھرتھری جسم آفتاب میں ہے

جھنجھلا کے باغباں نے مجھے ذبح تو کیا
اب رو رہا ہے منہ کو قفس پر دھر دھر کے

سمجھا دل وحشی جو قیامت ہوئی برپا
اٹھا کوئی دیوانہ رفتار کسی کا

دیکھو آکر بیمار تمہارا تو نہیں ہے
رکھا ہے جنازہ پس دیوار کسی کا

حکیم ضامن علی جلال

تعارف:۔ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا آبائی پیشہ طبابت اور داستان گوئی تھا شاعری میں نام پیدا کیا۔ رشک و برق کے شاگرد تھے۔ انداز بیان کی ندرت میں ان کا جواب نہیں۔ ساری عمر تحقیق زبان میں صرف کی۔

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا — ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا

ہم اور جاتے نہ پیر مغاں کی صحبت میں — بہت اچھالنے والے تھے اک شباب نہ تھا

کسی نے دیئے تسلی نہیں قیامت کی — کہ آج ہے جو تڑپ کل یہ اضطراب نہ تھا

تغافل کے گلے سن کر چھپا لیں تم نے کیوں آنکھیں — مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

تڑپ دل کی دکھانا تھا جلال ان شوخ چشموں کو — وہیں کی بخت نے سستی جہاں چالاک ہونا تھا

کہاں ان سے کہیں قصۂ شب تنہائی کا! — شمع خاموش کو یارا نہیں گویائی کا

زیادہ ہم خدا سے کریں بھی تو کیا کریں! — مارے ہوئے تغافل و جور بتاں کے ہیں

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق — حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

عشق بتاں کا جرم نہ بخشا خدا نے بھی! — ان کا گناہگار گناہگار ہی رہا

اہل دل کے لئے راحت نہیں اس سے بڑھ کر — جس کو سمجھا ہے وہ بے درد دکھاتا دل

میری قبر کے فرشتے یہ نہ پوچھیں کیوں ہو چکے — کہ جواب ہی نہ سنتے جو بجا سوال ہوتا

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے! — اسی کو بھیجدیا یار کی خبر کے لئے

لٹک کے زلفیں جو آپڑی ہیں کمر کسی کی لچک رہی ہے — بلا کی آئی ہیں دو گھٹائیں غضب کی بجلی چمک رہی ہے

مجھے یہ ہے کہ جان اتنی بخدا خوشی نہ ہوتی — مرے مرنے کا ذرا بھی جو تمہیں ملال ہوتا

دل کسی کے عشق میں اچھا ہوا جاتا رہا — داغ تھا اک مٹ گیا اک درد تھا جاتا رہا

دل ہمارا اور یوں ہو جائے ہم سے منحرف — آج اس کج ادائی کا گلا جاتا رہا

دل ہو وہ چشم مست ہو وہ دور شراب ہو — کوئی خراب ہو تو بلا سے خراب ہو

تم تسلی میں نہ کرنا اپنی جانب سے کمی — گو تڑپ اس سے مرے دل کو سوا ہونے لگے

بند ہو کر جلوہ گاہ یار میں آنکھیں کھلیں — ہوش جاتے ہی حواس اپنے بجا ہونے لگے

اکیلے کا کہیں دو سرکشوں سے زور چلتا ہے — دوپٹہ لاکھ سینہ پر سنبھالو کب سنبھلتا ہے

ہم بھی قدر اپنی وفا کی نہیں کھوتے والے — او جفا کرکے پشیماں بھی نہ ہونے والے

دے چکا ساتھ ہمارا شب تنہائی میں — بے مروت ہے یہ دل میں کا بھرا جل گیا ہے

بن سنور لیجئے تو دیکھیں گے وہ انداز اپنے — لوٹے آئینہ حیراں ابھی تکتا کیا ہے

یاد ہے اتنا وہ اٹھ کر کہیں رونا جانا — اور وہ پوچھنا گھبرا کے کسی کا کیا ہے

جھک کے شرمائی نگاہیں کبھی اٹھتیں لو سہی — آپ کو کیا جو زمانہ تہ و بالا ہوتا

غیر کے سامنے ہنستے نہ مرے رونے پر — تم نے گرتی ہوئی بجلی کو سنبھالا ہوتا

یاس نے ساری امیدوں کو مٹایا دل کی — ورنہ اس گھر میں بہت کچھ سروساماں ہوتا

بیٹھو نادم ہو ذرا آنکھ ملاؤ تو سہی — یوں جفا کر کے نہیں کوئی پشیماں ہوتا

دیتا جو تسلی وہ نہیں اور تڑپتے — اس شوخ کو بیتاب بھی کرنا نہیں آتا

شب فراق تڑپ کر نہیں تو گذری تھی — سنا ہے تم نے بھی آرام رات بھر نہ کیا

کلیجہ کوئی تھام کر رہ گیا ہے — ادھر جانے والے ادھر دیکھ لینا

گذرتی ہے شب یوں تمہارے منتظر کی — ادھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا

کبھی اس نے جو کہا او مرے مرنے والے — ہو گیا اور بھی جینا نہیں دو بھر اپنا

آنکھ ملتے ہی یہاں قابو نہ کچھ دل پر رہا — آپ کے بس میں نہیں معلوم وہ کیونکر رہا

کہتی ہے تڑپ ضبط فغاں ہو نہیں سکتا — اب درد نہاں جیسے نہاں ہو نہیں سکتا

بت ہنگامے کیوں عشق میں بت کے نہ پوچھو — اس چپ کا سبب ہم سے بیاں ہو نہیں سکتا

بتوں کے عشق میں انجام کار کیا ہوگا — اٹل گئے مرے پروردگار کیا ہوگا

تنہا شبِ غم عاشق کامل نہیں ہوتا
تم دل لگی جگہ ہوتے ہو جب دل نہیں ہوتا

دیکھتے دیکھتے وہ میں تڑپتا تھا
قابلِ دید یہ تماشا تھا

سن کے نام اس کا دل کو تھام لیا
نامہ بر سچ بتا کہ یہ کیا تھا

کیا دکھے دل کو پھر دکھاؤ گے
تم نے کس دن مزاج پوچھا تھا

وہ آبدیدہ جو سنکر مرا افسانہ ہوا
مجھے بھی اشک بہانے کا اک بہانہ ہوا

دلِ ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے
کام اس سے بھی نکل جاتے تھے بیداد نہ تھا

عشق میں دل جو مرا ہمدم و ہمراز بھی تھا
وہی کم بخت تو رسوا کنِ غمازی بھی تھا

یوں مری رات تری منتظری میں گزری
چشم بر راہ بھی تھا گوش بر آواز بھی تھا

اگر عشق میں سب ان کی ہشیاری کی باتیں تھیں
مگر قسمت میں تھا دیوانہ ہی مشہور ہو جانا

وفا مانع ہے ذکر اس کی جفا کا ہو نہیں سکتا
شکایت کا محل ہے اور شکوہ ہو نہیں سکتا

قضا کہتی ہے زندہ کشتہ اس کا ہو نہیں سکتا
ادا کہتی ہے کیا قاتل مسیحا ہو نہیں سکتا

جانے کیا بے اختیاری ہے جلال
دل جو ہے بس میں، نہ قابو یار پر

کیا لطف دے رہا ہے بگڑنا عتاب میں
لاکھوں بناؤ ہیں تمہارے اک پیچ و تاب میں

کیوں آ کے دے گئے وہ تسلی ستم کیا
اب تو بہت کمی تھی مرے اضطراب میں

جفا کرکے وہ کیوں پچھتا رہے ہیں
وفاداری سے خود شرما رہے ہیں

غضب کا سامنا ہے حشر میں بھی
نقاب اٹھتی نہیں شرما رہے ہیں

خدا سمجھے جلال ان ناصحو سے
نہیں معلوم کیا سمجھا رہے ہیں!

مجنوں کے غل نہ شور وہ اب کوہکن میں ہیں
ڈھنگ بچے ہوئے مرے دیوانہ پن کے ہیں

چلا ہوں لے کے میں فریاد انکی وہ میری
اب اس میں دیکھئے پہلے سنے خدا کس کی

نظر فریب اداؤں پہ آ ہی جاتا ہے
ہزار روکتے سنتا ہے دل بھلا کس کی

تڑپ میں ہے جو مزہ وہ سکونِ دل میں کہاں
ہم اپنے درد کی خود ہی دوا نہیں کرتے

اثر کچھ ان کے دل میں کر گئی آہ و فغاں میری
کہ خود وہ چھیڑ کر سنتے ہیں مجھ سے داستاں میری

زاہد تو ہے دیوانہ حوروں کا وہ کیا جانے
عالم کو ترا سودا اے رشکِ پری کیوں ہے

منہ سے کچھ حشر میں بھی کہہ نہ سکوں
بت بنا دے خدا کرے کوئی

اس صنم کو جو ہم خدا سمجھے
لوگ کیا جانے ہم کو کیا سمجھے

کسی بے درد کی دل آزاری!
درد کی اپنے ہم دوا سمجھے

کٹ گئی پاؤں کی بیڑی جو پہن لی زنجیر
ہوشیاری کوئی سیکھے ترے دیوانے سے

شغل ہیں لیے یہ صبح و شام کے
چند آہیں کھینچنا دل تھام کے

اٹھ کے اس محفل سے اٹھتا ہے وہ درد
بیٹھ جاتا ہوں کلیجہ تھام کے

اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کے ہم شاکی ہیں
کیوں بگڑتے ہیں کیا شکوہ تمہارا کس نے

مذہبِ عشق ازل ہی سے نہیں آیا ہے پسند
وہ کوئی اور نہیں حضرتِ انساں ہونگے

دم بھرے جائیں گے اس سفاک کا
جائے اسیں یا ہمارا دم رہے

کچھ زیادہ ہو چلا شوقِ وصال
زندگی کے دن بہت اب کم رہے

سجدہ کوئی قبول ہمارا ہو یا نہ ہو
لیکن جبیں ہو اپنی ترا آستانہ ہو

ابھار دیتی ہے اس کی جفا کو میری دعا
غرض کہ نوبتِ ترکِ جفا نہیں آتی

بتوں کو دیکھ ہماری نگاہ سے اے شیخ
نظر ان آنکھوں کو شانِ خدا نہیں آتی

جلوہ کسی کا دیکھ کے آنکھیں سی کھل گئیں
پردے جو غفلتوں کے پڑے تھے الٹ گئے

چٹکیاں لیں مرے لیتے ہو چپکے چپکے
اور پھر دل میں شکایت مری فریاد کی ہے

چھپا لاکھ رازِ عشق افشا ہو ہی جاتا ہے
اگرچہ چپ بھی رہے عاشق تو رسوا ہو ہی جاتا ہے

نہ ہو برہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا ہم نے
چلو جانے دو بیتابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے

رہے گی رحمتِ حق دور زاہد تم سے
گناہ ہے یہ تمہارا کہ بے گناہ رہے

خدا سے کہتے ہیں بت بھی کہ رحم کر ان پر
نہ ہو گا عاشقوں میں ہم سا کوئی مضطر بھی

کہیں سمجھے ہیں دیوانے یہ ہر عاقل سمجھتا ہے
محبت میں کسے سمجھایئے کب دل سمجھتا ہے

جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہے
نہ یہ ناداں سمجھتا ہے نہ وہ جاہل سمجھتا ہے

سنگِ در اس کا ہے پیشانی میری
اب نہ سر پھوڑوں تو نادانی مری

پھرتے ہیں میری نظروں میں وہ جب
پھر کوئی دیکھے پریشانی مری

بعد ترکِ عشق کے کیسی پشیمانی ہوئی
عقل کا کہنا کیا ہم سے یہ نادانی ہوئی

توفیق انھیں رنج ہی دینے کی خدا دے
خوش جس میں ہوں وہ ہم کو گوارا ہے خوشی سے

اک مسیحا سے جو الفت ہو گئی!
بے اجل مرنے کی عادت ہو گئی

اٹھکھیلیوں کے ساتھ ہے مستانہ ادا بھی
پامال کیے دیتی ہے دل لغزشِ پا بھی

آفت تھی کسی کی نگہِ ہوش ربا بھی
یوں ہوش گئے ہیں کہ نہیں جن کا پتا بھی

جلال! کہتی ہے ہشیار رہنا
نقاب اٹھتی ہے سامنا ہے کسی کا

اٹھ گئیں تھیں کہیں اس شوخ کی نیچی نظریں
دیکھ لیں ہم نے دو عالم تہ و بالا دیکھا

ہم نہ کہتے تھے کہ تم اس کو نہ دینا تسکین
اور دل نے تپشِ دل کو اچھالا دیکھا

دل کو کب تک دردِ دل تڑپائے گا
صبر ہی انجام کار آ جائے گا

ہوشِ رفتہ دیکھئے جب آئے گا
تیرے بے خود کو کدھر لے جائے گا

سمجھے تھے کہ فرقت میں مر جائیں گے ہم جلدی
اس میں تو قیامت کی تاخیر نظر آئی

حسرت جو مری دیکھی حیران سے ہیں وہ بھی
تصویر کے پہلو میں تصویر نظر آئی

وہ ترچھی نگاہوں سے محفل میں ادھر دیکھیں
سیدھی ہیں کچھ اپنی تقدیر نظر آئی

گذرتی ہے محبت میں جو ہم پر
وہ حالت دوسرا کیا جانے کیا ہے

تم لگا دو آگ ٹھوکر ناز سے
کون اٹھے حشر کی آواز سے

خود پکار اٹھا جو دل میں راز ہے
تو بھی خاموشی بڑی غماز ہے

مہرباں کو دیکھے دل نامہرباں دیکھا کئے
جو دکھایا تو نے ہم اے آسماں دیکھا کئے

اللہ رے عاشق کی زخود رفتگی شوق
یوں ہے تری محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے

نجم الدین علی عرف علی میاں کامل

تعارف :- مولانا احمد علی صاحب مجتہد کے بیٹے ـــــ ولادت معلوم نہیں غدر میں جوان تھے ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ مشرقی علوم میں صاحب استعداد ممتاز تھے علامہ سید محمد تقی صاحب کے شاگرد۔ شاعری میں ہر صنف پہ قادر تھے ان کے کمال کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا انھوں نے امیر مینائی۔ جلال ماہر اور منیر سے غزلوں میں مقابلہ کیا اور مرثیہ میں میر نفیس کے مدمقابل ہے اور برابر کی ٹکر لی اپنا کلام خود کبھی نہیں پڑھا لوگوں کو کہہ کے دیدیا۔

دولت کے معاملہ میں بھی یہی حال تھا لاکھوں ملے اور دو دن میں لٹا کر بیٹھ گئے ان کی پہلی شادی حکیم باقر حسین کی صاحبزادی سے ہوئی جو شاہی اطباء میں تھے اور دولت کے لحاظ سے لاکھوں کے بیٹے میں تھے ایک ہی لڑکی تھی جو ان کی وارث ہوئی محبوب گنج میں ایک شاندار حویلی اور باغ تھا سب کامل صاحب کی داد و دہش کی نذر ہو گیا اور فاقوں کی نوبت آگئی تو نواب سردار بہادر اور نواب نادر صاحب نے تنخواہ مقرر کر دی جو آخر دم تک بسر اوقات کا ذریعہ رہی ان کے بے شمار شاگرد لکھنؤ میں تھے باہر کے شاگردوں میں میر مصحف حسین رئیس مصطفےٰ آباد ضلع پرتاب گڑھ اور رستم علیخاں رئیس دھولپور (جوش صاحب کے نانا) تھے۔

مولانا صفی کو ان کی سوتیلی بہن بیاہی تھیں جو ان کے والد کی تیسری بیوی سے تھیں اب ان کا کلام سنئے۔

نہاں ہونے پہ تیرا نور ہر شے سے نمایاں ہے
جو تو اے شاہد معنی عیاں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ کرشمے دکھتے ہر وقت کا یہ ناز نہ تھا
آپ کی آنکھوں کا اگے تو یہ انداز نہ تھا

جا کے دیکھ آئے مرقع میں شبیہ یوسف
ہم جس انداز کے خواہاں تھے وہ انداز نہ تھا

ہم نے مانا کہ قیامت کی تڑپ تو ہیں تھی — آپ کے جلوہ جاناں کا انداز نہ تھا
جا کے دیکھا تو عجب امن کا گوشہ تھا مزار — غم نہ تھا عیش نہ تھا سوز نہ تھا ساز نہ تھا

شرم کے پردے میں اب کرنے لگیں کام اپنا — آگئے ان نیچی نگاہوں کا یہ انداز نہ تھا
میں نہ مانوں گا کہیں میرے جلانے کو رقیب — برق کے جلوہ میں اس شوخ کا انداز نہ تھا

جان پر آ تو بنی جاتی ہے کہئے کامل — آگئے افسردگی دل کا یہ انداز نہ تھا
صفت عشوۂ جاناں نہ سہی تھا ناز بھی تھا — سحر بھی آنکھ میں اس شوخ کی اعجاز بھی تھا
ایک خنجر ہی نہیں قتل کا میرے مجرم — ذبح کرنے میں شریک آپ کا انداز بھی تھا
قید سے ہو کے رہا مرغ چمن کیا کرتا — دل کے ہمراہ شکستہ پر پرواز بھی تھا

یکساں ہے ہم شکستہ دلوں کو حیات و موت — شادی نہ زیست کی ہے نہ غم انتقال کا
پوشیدہ راز ہائے جوانی نہ رہ سکے — پیری نے حال کھول دیا بال بال کا !!
کہنے میں آپ آگئے لوگوں کے اے کلیم — کوئی محل نہ تھا ادنی کے سوال کا

اب رہائی کی تمنا نہ کر اے مرغ قفس — سوئے گلشن تو اگر بے بال و پر آیا تو کیا
ناوک مژگاں سلامت اس ستمگر کا رہے — زخم اے کامل ہمارا دل کا بھر آیا تو کیا

نیند میں ان کی مژہ کھلتی کبھی ہوتی تھی بند — مرتعش کے ہاتھ میں جام شراب ناز تھا

بام پر کل جو کیا یک وہ پریزاد آیا — شیخ تو شیخ برہمن کو خدا یاد آیا
گل و بلبل کے مقدر پہ ہنسی آتی ہے — باغباں جانے نہ پایا تھا کہ صیاد آیا
کام سیکھا بھی تو وہ جس سے کلیجہ ہو لہو — دل کو آیا بھی تو کیا شیوۂ فریاد آیا
دیکھ کر گلشن فردوس میں حوروں کا جمال — یاد اے دوست ترا حسن خداداد آیا
اب مجھے ضبط فغاں کی نہیں طاقت باقی — کیوں قفس لے کے مرا باغ میں صیاد آیا

حسیں کا عشق کہ سودائے زلف یار نہ تھا — ازل میں کیا دل غمدیدہ داغدار نہ تھا
جگر کو خون کیا تھا سحر کے دھڑکوں نے — شب وصال میں بھی قلب کو قرار نہ تھا

فغاں کو ضبط کیا یہ تھمے نہ ہجر میں اشک — کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا
مآل آمد فصل بہار کیا ہوگا — کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا
شب فراق میں ہے شام ہی سے نزع کا حال — سحر جو ہوگی تو پروردگار کیا ہوگا

خوش ہوں بے ساقی کے ہم رندان آشام کیا — ہے نہ ہو تو شیشہ کیا سبو کیا جام کیا
جب ہوا دیں تلاطم درد کا رونے لگے — کوئی یہ بارش نہیں اس کے لئے ہنگام
عیش و عشرت اہل دول کو مبارک روز و شب — ہم سے بختوں کیلئے کامل سحر کیا شام کیا
ابتدائے عشق ہے اس پر نہیں دل کو قرار — دیکھئے ہوتا ہے اس آغاز کا انجام کیا
بادشاہوں کو مبارک تخت و فر اور سلطنت — مرد مفلس ہوں مجھے طبل و علم سے کام کیا
کیوں دعا ہوتی نہیں یا رب ہی بیمار مستجاب — عرش سے بھی مرتفع ہے ان بتوں کا بام کیا

بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے — غربت میں جب دیار وطن یاد آ گیا

نفس امارہ نے کیا سخت اذیت دی ہے — ساتھ ہے سایہ کے مانند یہ رہزن گویا

فنا ہو روح تو آزاد ہوں عناصر بھی — ورق ہیں قید میں شیرازہ کتاب کے ساتھ

مجھے منعم نہیں معلوم رتبہ خاکساری کا — یہ وہ مٹی ہے جو روکش گہر آئینہ دل ہے
ہمارا ہوش میں آنا نہ آنا ایک ہے کامل — کہ ہم ہیں دل کے بس میں اور وہ دیوانہ غافل ہے

حکم سجدہ کا ہوا اس کو خدائے پاک کا — اور آگے کیا کہوں کیا ہے یہ پتلا خاک کا

سمجھ میں زردی رخسار سے آ جاتا — بیان غم نہیں محتاج ترجمانوں کا

اے دل بتوں کے تیر نظر سے خدا بچائے — چھوٹا کماں سے اور کلیجہ کے پار تھا

ہوس نسخہ اکسیر کا یہ جزو اعظم ہے — غبار راہ پیدا کر جہاں میں اہل ہمت کا
کتاب ہمت دل میں کہیں تو یاد آتا ہے — دیا تھا ایک نقطہ ہم صحرائے قیامت کا

اپنا ہی اگر حسن دل آرا نہیں دیکھا — اس شوخ نے قدرت کا تماشا نہیں دیکھا
دل پاک کہ دور سے کسی کا نہیں دیکھا — اس آئینہ کو ہم نے مصفیٰ نہیں دیکھا

عبرت کے سوا کوئی تماشا نہیں دیکھا — کچھ ہم نے گنبد مینا نہیں دیکھا
کھلتا نہیں کس کرب میں ہے آج دل زار — یوں سینہ میں سکوتہ و بالا نہیں دیکھا

دیا تھا جو لطف و مرحمت سے آپ نے آج تا زیر آگئی — خدا میں بندہ میں لے فرشتو حساب کیسا کتاب کیسا
کبھی وہ آئے تھے ایک شب کو قلق جدائی کا آج تک ہے — لگی نہ پھر آنکھ زندگی بھر ہم نے دیکھا تھا خواب کیسا

غور کر دل کی حقیقت میں خدا مل جائیگا — دیکھ آئینہ کو جوہر کا پتہ مل جائے گا

پیری میں بھی رہے گی جلن داغ عشق کی — دن کو بھی یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

چشم مردم میں کھٹکنے کے سوا صورت خار — فائدہ کوئی مجھے نشو و نما سے نہ ہوا

خدا کسی کی محبت کا داغ دل کو نہ دے — یہ زخم وہ ہے کہ جو مندمل نہیں ہوتا

نمود حسن میں ہیں اے جان اگر شک ہے ابھی ہم کو — تجھے کا کرا ہمکو دکھو آئینہ چاک گریباں کا

سرکشی پھر تو فرشتوں سے بھی انساں کرتا — سجدہ اس خاک کے پتلے کو جو شیطاں کرتا

یار کے حسن سے آنکھوں کی تشفی کیا ہو — کام اس مائدہ پہ ہے لب و دنداں نکلا
ہوش میں آئی جو موسیٰ تو یہ پوچھے کوئی — ابتو اللہ کے دیدار کا ارماں نکلا!

مٹ گئے بات سے تمہاری صنم — شکر ہے نقش بشدا مکان کا
عاشقوں کے دلوں کا نام نہ لو — ذکر کیا خانہ ہے ویراں کا

غم دوست ہے اس قید سے آزاد نہ ہوگا — ہم خوش بھی کریں دل کو تو یہ شاد نہ ہوگا

کفر و اسلام کے یارب ہیں یہ جھگڑے کیسے — ایک ہی رشتہ اگر سبحہ و زنار میں ہے

شام ہی سے نہ گلا گھونٹ مرا اے شب ہجر — صبح تک دیکھ تو لینے دے کہ ہوتا کیا ہے

قفس کی قید ہے آزادی مرغ ! — نہ ہو جب قوت پرواز پہ سین
نہیں سرمہ کا چشم یار میں خط — کمند ناز ہے دست نظر میں

چشم رحمت سے نظر کر ذرۂ خاک پہ — ہمت عالی سے پیدا کر داغ آفتاب
لا مکاں تک کے آخر کو پھرے گا شام تک — طائر اندیشہ پہنچے گا نہ اس کے بام تک

پاؤں پڑیں نے جو شوق ذبح میں رکھ دیا — مسکرا کر ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھ دیا
یاد پینے میں جو آئی نرگس مخمور یار — ہاتھ سے میں نے گلگوں کا ساغر رکھ دیا

کم نہیں طاعت میں ذرہ تیرے دیکھنا — کون گزرا تھا ابھی اس رہگذر سے دیکھنا

قصہ فراق یار کا دو دوستو ایک رات میں — تم نے سنا تو کیا سنا میں نے کہا تو کیا کہا

محتاج عشوہ کب ہیں جوانی میں خوش جمال — دل خود بخود بہار میں کھنچتے ہیں سوئے گل
بلبل کی طرح کا ہے کو ہوتا میں نالہ کش — دیتا اگر خدا دل بے آرزوے گل !

داغ الفت سے جلے جاتے ہیں میرے استخواں — دل کے پہلو میں الٰہی کس نے اخگر رکھ دیا

بیتر نہ تنگئی دل آ کے جو دیکھی یارب — چاک سے زخم تمنا کے پرافشاں نکلا

فغاں کو ضبط کیا پر نہ تھم سکے یہ اشک — کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا

رات کچھ ایسی ادا سے وہ پریزاد آیا — دیکھنے والوں کو محفل میں خدا یاد آیا

خاموش نہ کیوں ذکر جوانی میں رہیں ہم — آنکھوں نے ہماری یہ تماشا نہیں دیکھا

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا رنگ

محمد جعفر امید

ناسخ کے بعد غزل میں اصلاحی تحریک محمد جعفر صاحب امید نے پیش کی وہ معشوق مجازی اس کے حسن ظاہری اور سامان آرائش کا ذکر نہیں کرتے تھے محبوب کو حالت اطلاق میں رکھتے تھے اس کا مرد یا عورت ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا لفظ یار کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ شراب کباب کا ذکر زاہد و ناصح پر پھبتی حضرت خضر کی عمر یوسف کے حسن موسیٰ کے طلب دید کا مذاق اڑانا یا اس کی تحقیق کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے [1]

یہ تحریک ان کی زندگی تک تو باقی رہی ان کے کچھ شاگردوں نے بھی ان کی تقلید کی مگر ان کے بعد مر گئی اور اس کو مرنا بھی چاہیے تھا اس سے غزل کی ساری دلکشی ختم ہو جاتی۔

---

[1] مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کے لئے یہ اصلاحیں تجویز کی ہیں مگر کہیں امید صاحب کا ذکر نہیں کیا جو کھلا ہوا سرقہ ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ توارد ہے سرقہ نہیں ہے مگر یہ صحیح نہیں مولانا حالی جس زمانہ کے آدمی ہیں اس زمانہ میں دہلی اور لکھنؤ کو زبان کا مرکز سمجھا جاتا تھا عام طور پر لوگ لکھنؤ کی اصلاحیں جاننے کے خواہشمند رہتے تھے اسی ضرورت سے خورشید صاحب نے افادات لکھی تھی جس میں ان کا ذکر بھی ہے سنہ ۱۸۹۰ء میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی خورشید صاحب لکھنؤ کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور ان کی شہرت تھی شاداں بلگرامی وغیرہ ان کے شاگرد تھے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ مولانا حالی ان سے بے خبر ہوں خاص طور پر ان کی کتاب سے جس کا موضوع فن شاعری اور لکھنؤ کے اس وقت کی زبان و شاعری میں اصلاحیں ہیں۔

امید صاحب مولانا سید محمد باقر شریف الملک منصف الدولہ (متوفی سنہ ۱۳۵۸ھ) کے بیٹے اور سلطان العلماء سید محمد مجتہد العصر (متوفی سنہ ۱۲۸۴ھ) کے پوتے سنہ ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۳۶۳ھ میں انتقال ہوا۔ محلہ معالی خاں میں مکان اور امام باڑہ تھا وہیں سکونت تھی۔

غدر کے بعد انگریزوں نے سلطان العلماء کی دو ہزار روپیہ ماہوار کی پنشن پشت در پشت کے لیے مقرر کی تھی مگر ان کی اولادیں بہت تھیں اور اکثر ان کے ساتھ مر گئی تھیں بہت سے پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں محجوب تھیں ان کے لیے گورنمنٹ نے جین حیاتی پنشن مقرر کی تھی امید صاحب بھی انہیں میں سے تھے جن کو سو روپیہ ماہوار جین حیاتی پنشن ملتی تھی وہی ذریعہ معاش تھا۔

تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ دبلے پتلے متوسط قد کے آدمی تھے چوگوشیہ ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے جو اس زمانے کے شرفاء کی وضع تھی۔

اولاد میں صرف ایک بیٹے محمد کاظم عرف بندہ کاظم جاوید (اپنے زمانہ کے مشہور شاعر) تھے دو مرثیے اور ایک دیوان یادگار چھوڑا مرثیے عام طور پر لکھنؤ میں سنے تھے دیوان جاوید صاحب کے پاس تھا ان کے بعد ان کے بھتیجے مجاور حسین صاحب تمنا کے ہاتھ لگا وہ اسے چھپائے رکھنے اور کسی کو نہ دکھانے ہی میں اس کی حفاظت سمجھتے تھے بڑی مشکل سے چند غزلیں مجھے دی تھیں یہ ان کی بڑی عنایت میرے حال پر تھی اب ان کے انتقال کے بعد اس کا کیا حشر ہوا نہیں معلوم۔

امید صاحب کی اہمیت کا جب مجھے علم ہوا تو ان کے حالات معلوم کرنے کی فکر ہوئی مگر کوئی بتانے والا نہ ملا۔

خمخانہ جاوید اور آب بقا میں ان کا ذکر ہے مگر کوئی کارآمد بات نہیں۔
شاد عظیم آبادی نے ذکر شعراء میں ان کی نفاست و پاکیزگی ذوق

یہ واقعہ لکھا ہے کہ میر انیس کے ایک بند میں تار بار قافیہ اور "پہ ڈورے" ردیف نظم ہوگئی جس مجلس میں انھوں نے وہ مرثیہ پڑھا اس میں امید صاحب بھی شریک تھے جب انھوں نے وہ بند پڑھا جس کے دو مصرعے ہیں ؎

اس طرح ابر گہر بار پہ ڈورے
جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

امید صاحب نے کہا واہ کیا ردیف ہے تعریف نہیں ہوسکتی برسوں اس کے چرچے رہے۔

مشہور ہے کہ انھوں نے بجلی کی صدا اور اس کے تار پر دوڑنے کو بھی غلط کہا تھا۔

میر انیس نے ردیف کے بھونڈے پن پر تو خاموشی اختیار کرلی مگر بجلی کی آواز اور اس کا تار پر دوڑنا کسی اور مجلس میں ثابت کیا۔

افادات مصنفہ مولانا سید محمد مصطفےٰ صاحب خورشید (متوفی سنہ ۱۳۱۸ھ) سے معلوم ہوا کہ علم قیافہ میں بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی نہایت شگفتہ مزاج تھے بچوں میں بچے اور بوڑھوں میں بوڑھے جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو متوجہ کرلیتے تھے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے پرانے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ سالمہ کے موجد وہی تھے شاعری میں نواب عاشور علی خاں تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے جو نواب صاحب سعادت علی خاں کے پوتے صاحب علم اور مقدس آدمی تھے اپنے دور کے مسلم اساتذہ میں شمار تھا بڑے بڑے نامی شاعر شاگرد تھے جان صاحب ریختی گو اور چرکین مزاحیہ گو بھی شاگرد تھے اور ہر ایک کو اس کے رنگ میں اصلاح دیتے تھے مگر خود صرف نعت و منقبت کہتے تھے ان کا سارا کلام مفقود ہوگیا صرف ایک منقبت تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے

قلمی نسخہ میں ملتی ہے جس سے ان کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اب امید صاحب مرحوم کا کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

کیا ہے لن ترانی نے تو دعوی بصیرت کا
وہی بینا ہے جو قائل ہوا ہے نفی رویت کا

جو آتا ہے تصور وسعت دامان رحمت کا
نسیم لطف پردہ کھول دیتی ہے عدالت کا

بڑھے تھے جو حجاب قدس رحمت سے بھی کچھ آگے
نہ ان پر بھی کھلا پردہ تری کنہ حقیقت کا

کچھ رفتگان ملک عدم کا نشاں ملا
ذروں سے خاک کے جو کوئی استخواں ملا

پہلے قلم اسی کو کیا باغباں نے
جس شاخ پر چمن میں ہمیں آشیاں ملا

امن انسان شماتت سے کہاں کھٹتے ہیں
دھر میں آتے ہی نام اہل جہاں گھٹتے ہیں

ساتھ آہوں کے جو آنسو بھی ٹپک جائیں گے
شعلے اور آہوں کے پانی سے بھڑک جائیں گے

پختہ کاروں کے مضامین نہ رہیں گے محفوظ
وہ ثمر نخل سے ٹوٹیں گے جو پک جائیں گے

عہد پیری میں بھی سرگشتہ ہوس رکھے گی
سر کو ہوگی حرکت پاؤں جو تھک جائیں گے

بار عصیاں سے ہمیں چارہ میں سبکی ہوگی
جو اٹھائیں گے جنازہ تو وہ تھک جائیں گے

روشنی داغ دل بزم دل مضطر میں ہے
یا چراغ طور کا جلوہ خدا کے گھر میں ہے

ملتا نہیں پتہ در و دیوار و سقف کا
تصویر لامکاں کی ہمارے مکاں میں ہے

باچشم راہ رو ملک عدم رہتے ہیں
دوش احباب پہ چلنے میں قدم رہتے ہیں

منتظر ہم سفروں کے ہیں بیٹھے جانے
رشک اس واسطے رخسار پہ تھم رہتے ہیں

شاکی ہے عبث رزق جو گرہ ملا نہیں لیتا
کوئی تجھے تقدیر سے افزوں نہیں دیتا

جھک گئے ملنے کو ترقی میں نہ چھوڑ
دیکھ اس رفعت پہ گردوں خم رہا

سودا ازل سے عشق حقیقی کا سر میں ہے
جس جا نظر کا کام نہیں وہ نظر میں ہے

امراض سے بنوی نجات اپنی ہے محال
داخل دوا کی فکر بھی جب درد سر میں ہے

رکتا نہیں ہے توسن عمر رواں کبھی
گھر میں بھی بیٹھنا مرا داخل سفر میں ہے

تو ہی اے شوق بتا ہے کوئی منزل بھی — داغ لالے کا بانگ درا سے نہ ہوا

خاک آگاہ شکست دل نازک ہے وہ ہوں — آشنا ٹوٹے شیشہ یہ صدا سے نہ ہوا

کیوں نہ تڑپائیں مجھے سوز الم میں آہیں — کون شعلہ ہے جو بیتاب ہوا سے نہ ہوا

ہوں وہ بے خود کہ ہیں شیشہ کو نکلتے دیکھا — جان گرا اپنا دل نازک میں نالاں ہو گیا

تھی یہ صورت تو اثر کا میں گلہ کیا کرتا — ہاتھ مطلب سے اٹھاتا تو دعا کیا کرتا

وہیں ہم زباں عجب ہو رہا ہے کچھ یا تمیز — چمن میں جس طرف اجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

نہ دیکھیں دیکھنے والے بھی اے رہے جلوہ — کھلے یہ حسن کہ آخر حجاب ہو جائے

ملتے ہیں ہاتھ جلے کاغذ کو وہ یوں — چھپ رہا جاتا نہیں تصویر سے

سن ترانی سے کھلا ناز کا بھی راز مجھے — پردہ ہوتا تو سناتے نہ وہ آواز مجھے

مرض موت ہوا دھر میں آغاز مجھے — میں تو کہتا تھا ہوا یاں کی ہے ناساز مجھے

تن خاک ہے تو زیست کا کیا اعتبار ہے — جو عضو ہے غبار کا نقش و نگار ہے

رحمت سے دور ہوں تو کروں ترک معصیت — یوں بھی تو مشکل اے مرے پروردگار ہے

رحمت کے اعتماد پہ جا ہر کئے گناہ — اب عفو وہ کرے نہ کرے اختیار ہے

اللہ دی شرم آئی جو تصویر بھی مری — آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دئے فرط حجاب میں

کشتہ ہوئی ہے کوئی تو ایسی ہی آرزو — آنسو تڑپتے آتے ہیں چشم پر آب میں

شاخیں بلائیں لیتی ہیں جھک جھک کے بار بار — عالم ہے نرگس کی نیند کا سبزے کے خواب میں

راضی ہوں دیکھ میرا تڑپنا جحیم میں — رحمت جو تیری دیکھ سکے اضطراب میں

رحمت کو اضطراب ہے نالا میں اہل حشر — یوں سر کو خم کئے ہیں کھڑا ہوں حجاب میں

لاکھ کوئی کچھ بجلی کی ادائیں ہیں گو آہ — فتنہ آنکھوں میں جوانی کا ہے مخمور نہیں

کوئی ہے لیں مگر آگ لگانے والا — آپ سے آپ جلے شمع یہ دستور نہیں

جس سے دن وصل کا بنجائے مری ہجر کی — سحر وہ نرگس جادو کو کبھی منظور نہیں

شاگردانِ اسیر

مہدی حسین ماہر

تعارف:۔ خاندان اجتہاد کے رکن رکین شہر کے بڑے رؤساء میں تھے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے عربی گھوڑوں سے اصطبل بھرا تھا چار گھوڑوں کی گاڑی پر نکلا کرتے تھے مشاعرے اور مجلسیں بڑی دھوم سے کرتے تھے ہم سکے تکلفات مشہور ہیں سنہ ولادت معلوم نہیں ۱۳۴۰ھ میں انتقال ہوا شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے خلاق معانی کہے جاتے تھے۔ مولوی علی میاں کامل کا دعویٰ ہے کہ ؎

سر زمین ہند میں ابتک نہیں پیدا ہوا — آپ کا ایسا بلیغ نکتہ داں نازک خیال

پیارے صاحب رشید کا قول مشہور ہے کہ ان کے ایسے شعر کوئی کہہ نہیں سکتا۔

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے لکھا ہے کہ ان کا مرتبہ انھیں سے کم نہیں ان کا خاص رنگ یہ ہے ؎

رگوں سے سر میں جیسے تشنہ شراب آیا — طنابیں کھینچ گئیں گرد ونیہ آفتاب آیا

مگر میں تسبیح کا ہوں دانہ جو اس کو کھونا تو اس کو پانا

ہزار پھیرتا رہے زمانہ فراق دیکھا نہ ہمنشیں کا

آوارگی کے لطف کو سوزن سے پوچھیے — لاکھوں بنائے گھر مگر اک میں مکیں نہیں

زباں سے کام کم لے گر بقائے دم کا خواہاں ہے — کہ عمر رشتہ گھٹتی جاتی ہے رفتار سوزن میں

حیرت مجھے روانی عمر بشر میں ہے — لنگر پڑا ہوا ہے سفینہ سفر میں ہے

کریں کس وقت کار دین و دنیا اہل عالم — نہیں ملتی ہے فرصت سانس لینے سے کوئی دم بھی

تاثیر ضعف عالم پیری میں دیکھنا — سایہ بھی بے عصا نہ چلا ہم جہاں چلے

اس طرح کے اشعار کے علاوہ ایسے شعر بھی بہت ہیں جیسے آجکل پسند کئے جاتے ہیں ؎

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی

تعارف | ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ لکھنؤ کے مشہور اساتذہ میں تھے اور اسیرؔ کے شاگرد تھے۔

تیرے بندوں سے کرتے ہیں یہ بت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شان کبریائی کا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلا الٹا مرے چاک گریباں کا

امیرؔ آئیں گے گیا کیا شمع اور راتوں کو چھپ چھپ کے
نیا انداز ہوگا تیرے مدفن پر چراغاں کا

پچھتا رہے ہیں خون مرا کرکے کیوں حضور
اب اس پہ خاک ڈالئے جو کچھ ہوا ہوا

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

شیخ کو تھوڑا نہ جانو یہ بڑا مکار ہے
ساری دنیا چھوڑ بیٹھا ہے تلاش حور میں

داور حشر کو بھائی میری ان کی چھیڑ چھاڑ
چھیڑ کر پوچھا مکرر کیا ہوا کیوں کر ہوا

چالاکیاں تو دیکھو مجھے قتل کرکے خود
اور دل سے پوچھتے ہیں یہ کیا ماجرا ہوا

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو
تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے!

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیرؔ
ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

راتوں کو مثل شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے
ہر پھول سے لپٹ کر روتا پھروں چمن میں

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری
جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری

خزاں تو خیر سے گزری چمن میں بلبل کو
بہار آئی ہے اب آشیاں لیے نہ رہے

شوخی بھی قیامت تری مستانہ ادا بھی
شگفتوں نے قدم چوم لیے لغزش پا میں

امیرؔ ایسی کہاں قسمت کہ پہنچیں اڑ کے پھولوں تک
کبھی چاک قفس سے جھانک لو دریا مگر نہیں

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

اے موت تجھ کو کیا کہوں تو ہی بتا سہی
ایک کام تھا ترے آنے بڑی دیر ہو گئی

غنچہ و گل کو تو سو بار شگفتہ دیکھا
غنچۂ دل بھی الٰہی کبھی خنداں ہوگا!

ایک پتلا اللہ نے بنائی یہ ہماری صورت
سیکڑوں پرزوں پہ کیا حال سلیماں ہوگا

دست وحشت تو سلامت ہے رفو گر مجھ کو
ایک جھٹکے میں نہ دامن نہ گریباں ہوگا

خواہش وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح
دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا

مرے لبوں پہ بیاں یار ہے یہ دم سم شعلہ ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

دو دن رہا یار غریب اب آرزو ہے یہ دل
مر رہے دو طرف پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

تری زباں سے کہ تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دو
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

جمال یار کو کہتے ہو تم کہاں دیکھا
کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا

وہی چراغ وہی گل وہی قمر وہی برق
نئے لباس میں دیکھا اسے جہاں دیکھا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولے جاتے رہے

آنکھ کیا ہے جو سنی ہے سحر ہے اعجاز ہے
اک نگاہ لطف میں سارا گلا جاتا رہا

شکوہ کسی سے بے دلی کا کروں میں کیا
یہ شیشہ چوٹ کھانے سے پہلے ہی چور تھا

آفت کی شوخیاں ہیں تمہاری نگاہ میں
محشر کے فتنے کھیلتے ہیں جلوہ گاہ میں

صورت تری دکھا کے کیوں پیدا ہزار حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

گرا کر زمیں میں ظلم سے کھینچ کا خفا تھا
دیکھا تو زیر خاک وہی آسمان تھا

بیداد تھی شوخی تھی جفا تھی کہ ستم تھا
ہونی تھی جو ہو گئی آپ میں جو کچھ تھا وہ کم تھا

دھیان کیوں الفت میں باندھا اس لب جاں بخش کا
ہائے حسرت دم نکلے اسے دیکھا ابھی گیا

امیرؔ کس سے کہوں کوئی اس پاس نہیں
شریک غم جو تھا اک دل اسے حواس نہیں

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیرؔ
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

ناز ہے تم کو بہت حسن کی یکتائی پر!
اک ذرا آئینہ خانہ میں تو چل کے دیکھو!

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی
کارواں عمر گزرا آگ باقی رہ گئی!

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا دور

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی

تعارف: ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا ان کی ادبی و شاعرانہ عظمت مسلم ہے۔

ادا میں سادگی ہے کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا — شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں — ستم کیسا کیا شرمائے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے — تعلی بڑھ گئی ہو بات جو پہلے پہل ٹالا

خوشبو سے یوں ہی ہوش ربا وصل کی شب تھی — گیسو ہوئے برہم تو کھلا نافہ چیں اور
اللہ رے ساقی کا بضد ہو کے پلانا! — کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ — تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

اڑ کے جاتی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر — کچھ پتہ دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں — نفس کو خوں فشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا — بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر — کوئی جھونکا باد سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا

ہنسی ہنسی میں وہ بات گہری کہ رہ گئے تم اپنا منہ لے کر — چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پر درد ہے فسانہ — یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتے ہیں پروانے — انھوں نے شمع کے شعلے کو شاید تاج زر جانا
ذرا سی آبرو جو قطرۂ شبنم سے بھی کم تھی — سنا جوہر شناسوں نے اسے آب گہر جانا

سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل — قادر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
آج گم دل میں کیا شہرۂ آفاق جسے — کل اسے محفل احباب کا افسانہ کیا
الحذر نظم بہت جھک کے فلک ملتا ہے — خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبح عہد پیری — یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جن میں کچھ درمیاں نہیں ہے
اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو او رہ تم — ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگ گل پر گراں نہیں ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا — جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے
منزل اسے سمجھ کے گھر لیتے ہیں ہم — بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

مجھے دو ڈرا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کر — کہ گرنا بار بار اچھا ہے اٹھنا دم بدم اچھا

مرزا محمد ہادی مرزا رسوا

تعارف: ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔

حسن شاہد ہے مری نیرنگیٔ تحریر کا ؏ اک ادا نے شوخ ہے جو رنگ ہی تصویر کا

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی ؏ اسی کافر کی ادا یاد آئی

تم کو الفت نہ ادا یاد آئی ؏ یاد آئی تو جفا یاد آئی

ہجر کی رات گزر ہی جاتی ؏ کیوں تری زلف رسا یاد آئی

لذت معصیت عشق نہ پوچھ ؏ خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا ؏ لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

کیا غزل کوئی کہی ہے مرزا ؏ آج کیوں باد صبا یاد آئی

وہ بھی دن ہوں گے کہ ہم باغوں میں پینے جائیں گے ؏ دیکھیے فصل خزاں کب جائے کب پینے جائیں گے

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج ؏ دشت میں جا کر گریباں آپ سینے جائیں گے

زندگی، دولت، جوانی، بے خودی، شوق وصال ؏ پھر ملیں گے بھی جو یہ سامان چھینے جائیں گے

موت ہی کو زندگی کہنا اگر ہے رسم عشق ؏ مرنے والے آپ کے قبروں میں جینے جائیں گے

اپنی قسمت راہ پر آئے تو مرزا دیکھنا ؏ کربلا ہوتے ہوئے اس کے مدینے جائیں گے

مشکل ہے ضبط گریۂ بے اختیار کا ؏ کب تک نگاہ بانیٔ دریا کرے کوئی

گو ادعائے شوق کے بالکل خلاف ہو ؏ لیکن یہ مصلحت ہے کہ پردہ کرے کوئی

ہاں اے نگاہ شوق مناسب ہے احتیاط ؏ ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

ہاں دیکھنا ہے اس کے جنوں کا بھی امتیاز ؏ مجنوں سے جا کے شکوۂ لیلیٰ کرے کوئی

دل بے نیاز اور طبیعت حیا پسند ؏ وہ کیا کریں جو خواہش بے جا کرے کوئی

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں ؏ طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں

ہم نشیں دیکھی نحوست داستان ہجر کی ؏ محفلیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں ؏ لیکن اب تمہید ذکر درد و ماتم ہو گئیں

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر ؏ ہائے کیا کیا صحبتیں، اتنی کہ برہم ہو گئیں

آئینے سے ہے ان کا رد و بدل ؏ تنگ ہیں شوخی، مقابل سے

شمع فانوس اس کی محفل میں ؏ چھپتی کیوں ہے اہل محفل سے

اور تو سب تری محفل میں جمے بیٹھے ہیں ؏ بار بار اٹھنے کو کہتا ہے ہمیں سے کوئی

سائلوں کے لئے اب کوئی سزا ہو تجویز ؏ جانتے ہو کہ نہ مانے گا نہیں سے کوئی

بے خودی میں بھی ہر ایک سے کہہ دیتا ہوں ؏ پوچھ لے جا کے مرا حال انہیں سے کوئی

خاک میں تم نے ملایا ہے کہاں مرزا کو ؏ حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج ؏ دشت میں چاک گریباں آپ سینے جائیں گے

سمجھا ہوں جو مراد ہے اس چھیڑ چھاڑ سے ؏ ناصح کو بھی ہوس ہے کہ رسوا کرے کوئی

کیا ہنسی کھیل دل لگانا ہے ؏ دل کا آنا قضا کا آنا ہے

دل ناداں سے کیا فریب کرو ؏ اس کے پہلو سے اٹھ کے آنا ہے

دشت میں بھی تو دل نہیں لگتا ؏ اس جنوں کا کہیں ٹھکانا ہے

شعر گوئی فقط بہانا تھا ؏ حال دل کا انہیں سنانا تھا

تجھ سے کیا چوک ہو گئی قاصد ؏ ساتھ ہی اس کو لے کے آنا تھا

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم ؏ کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

کچھ دنوں ہم سے دوستی رکھتے ؏ دشمنوں کو بھی آزمانا تھا

وحشت کے پابند ہیں دیوانگی [illegible] ؏ پھر لگایا جائے تو ہاتھیں کی زنجیر کا

شور فریاد تا فلک پہنچا ؏ مگر اس کو خبر نہیں ہوتی

تیرے کوچے کے بے نواؤں کو ؏ ہوس مال و زر نہیں ہوتی

جان دینا کسی پہ لازم تھا ؏ زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

پیارے صاحب رشید

تعارف:۔ سید مصطفٰے مرزا نام پیارے صاحب عرف رشید تخلص میر انیس کے نواسے سید مرزا انس شاگرد ناسخ کے بیٹے احمد مرزا صابر کے بھتیجے عشق اور تعشق کے بھتیجے سنہ ۱۲۶۲ھ میں ولادت اور سنہ ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۷ میں وفات ہوئی۔

سید اصغر شاہ صاحب نے صرف و نحو اور مرزا محمد اخباری سے فقہ اور مولوی انور علی حنفی سے معقولات کی تحصیل کی شوق مطالعہ نے استعد علمی بڑھائی شاعری میں اپنے چچا میر عشق اور تعشق کے شاگرد تھے دبلے پتلے میانہ قد لکھنؤ کی تہذیب و شرافت کا پتلا خوددار نازک مزاج کم سخن مرنجان مرنج انسان تھے معاصرین میں کبھی کسی سے سخن گسترانہ چشمک کبھی نہیں ہوئی غزل اور مرثیہ میں اپنے وقت کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور شہرت تھی انکے شاگرد آغا شمیر نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب حیات رشید کے نام سے لکھی ہے:۔

شروع عشق میں صبر اس دل مضطر سے کیا ہوگا
ابھی نا آشنا ہے رفتہ رفتہ آشنا ہوگا

ہے بے خود وصل میں دل ہجر میں مضطر سو ہوگا
خوشی جس گھر کی ایسی ہے وہاں کی رنج کیا ہوگا

ابھی تو یاد ہے کہنے کی باتیں دل میں لاکھوں ہیں
نہ کچھ یاد آئیگا اس وقت جس دم سامنا ہوگا

انھیں عشاق کی گستاخیوں کا خوف رہتا ہے
کبھی غافل نہیں سوتے کہ کوئی جاگتا ہوگا

وہ گیسو بڑھتے جاتے ہیں بلائیں ہوتی ہیں نازل
قدم تک آ گئے جب حشر عالم میں بپا ہوگا

غضب کرتے ہو میرے دل کو ابرو سے چھڑاتے
بھلا سوچو تو کیونکر گوشت ناخن سے جدا ہوگا

عدم میں کیسا کیسا دم رکے گا ایک مدت تک
نئی بستی نئی پوشاک ہوگی گھر نیا ہوگا

رقیبوں کی امیدوں کو جگہ دیتے ہیں ہم دل میں
کہاں ہیں سے کوئی آخر ہمارا مدعا ہوگا

بیاں ہوتا ہے دل کا راز جب ایسی ہو بیتابی
ترا شکوہ کرونگا میں فقط جس دن خفا ہوگا

نہیں ہے جس میں ترا عشق وہ دل ہے تباہی میں
وہ کشتی ڈوب جائیگی کہ جس کا نا خدا ہوگا

اپنے گناہ دیکھ کے دفتر میں روز حشر
ہنگامہ ہجوم ہوس یاد آ گیا

صد پارہ ہو کے پھیل گیا ہے ہمارا دل
شیرازہ کھل گیا ہے وفا کی کتاب کا

تنگ آ کے میرے تنگی احوال پر وہ کیا قبول
انجام یہ ہوا ہے تمہارے حجاب کا

صبر لازم تھا مجھے ظلم کرنا تھا تمہیں
یہ لباس عشق تھا وہ حسن کی پوشاک تھا

محشر میں ہے سوال گناہ و ثواب کا
یہ ذکر ہو رہا ہے ہیولے شباب کا

مانگی اجازت اور تری آنکھوں سے لی مدد
عالم نے جب ارادہ کیا انقلاب کا

نیند بھر کے بھی نہ پائی تھی کہ آیا وقت کوچ
کھول کر آنکھیں جو دیکھا قافلہ تیار تھا

ذکر وفا جو لے ستم ایجاد آ گیا
بھولے ہوئے تھے قصۂ غم یاد آ گیا

رستہ گیا ہے سوئے حقیقت مجاز سے
بت یاد آ گیا تو خدا یاد آ گیا

دنیا کے سب امور فراموش ہو گئے
کیا جانے دفعتہً ہمیں کیا یاد آ گیا

ہم زمانے سے گئے ہجر تن و جان ہو گیا
آج بالکل فیصلہ اے شام ہجراں ہو گیا

غش پڑے تھے ساکنین شہر خموشاں تم آ گئے
سب نے آنکھیں کھول دیں گویا چراغاں ہو گیا

اب ہوا ثابت کہ یکرنگی ہے حسن و عشق میں
آپ کا گیسو ہمارا دل پریشاں ہو گیا

دست وحشت نے بڑھائی اور بھی دیوانگی
جادۂ دشت جنوں ہر تار داماں ہو گیا

مجموعہ زلفیں بنانے میں ہیں پروا بھی نہیں
کس بلا کا بیکلا حال کس کا دل پریشاں ہو گیا

لائے ہمراہ چھری کا دوسری قاتل میرا
خون اغیار میں ہو جائے نہ شامل میرا

گو برا ہے دل مگر رہنے دیا ہے اس لئے
عشق کی خو گر طبیعت ہے کبھی کام آئے گا

قاصد مرگ آئے یا آئے تمہارا نامہ
کہہ رکھا ہے دل کہ کوئی آج پیغام آئیگا

روح کا تن سے نکلنا آنکھ جانا ہے ایک
کچھ عجب ہنگام ہو جب وہ ہنگام آئیگا

دونوں آنکھیں دل جگر مرغ و تن ہو لئیں شریک
یہ تو سب چھپے رہیں گے مجھ پہ الزام آئیگا

سفر سے بھی بہت گھبراتے تھے جب بضرورت کہیں جانے لگتے تو کوئی
شاگرد قرآن کے نیچے سے نکالتا اور وہ دعائیں پڑھتے دونوں بازوؤں
پر دم کرتے گھر سے نکلتے تھے۔

خلیق متواضع منکسر مزاج اور صاف دل آدمی تھے سیکڑوں
لطیفے یاد تھے جہاں بیٹھ جاتے تھے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔
شیرازی کبوتروں کا شوق تھا نہایت عمدہ قسم کے رنگ برنگے کبوتر
پلے تھے جب ان کی ڈھابلیاں کھلتی تھیں تو ایک چلتا پھرتا باغ نظر آتا تھا۔
رنگ کے بہت شوقین تھے پان کثرت سے کھاتے تھے۔ شاعری کا بچپن
سے شوق تھا محمد مصطفیٰ عرف لڈن صاحب خورشید کے شاگرد تھے۔

شاعری میں ان کی شہرت غزل گوئی سے ہوئی اور اپنے زمانہ میں
لکھنؤ کے سب سے بڑے غزل گو کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان کا مزاج شاعرانہ
تھا غزل سے فطری مناسبت تھی اوائل عمر ہی سے انہوں نے شہرت حاصل کر لی۔

مہدی حسین صاحب ماہر کے انتقال کے بعد وہ مالی پریشانیوں
میں مبتلا ہو گئے اور غالباً اسی زمانہ سے مرثیہ کہنا شروع کیا جو اس زمانے
میں باعزت ذریعہ معاش تھا اس میں بھی انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی
اور لکھنؤ کے چوٹی کے مرثیہ گویوں میں شمار کئے گئے۔ حضرت انجم لکھنوی
نے اس زمانے کے اکابر مرثیہ گویوں کا ذکر ایک رباعی میں اس طرح کیا ہے:

اس عہد کے بس یہی ہیں پانچ شاہانِ سخن — حقا کہ انھیں کے دم سے ہے شانِ سخن
جاوید و عروج و عارف و اوج و رشید — یہ پنجتن پاک ہیں ایمانِ سخن

وہ مرثیے پڑھنے کے لئے دور دور بلائے جاتے تھے دو مرتبہ نواب عماد الملک
کی دعوت پر حیدرآباد گئے۔ اصغر آباد پنڈرہ اول جانسٹھ ضلع مظفرنگر
ہر سال بلائے جاتے تھے اور ہر جگہ سے معقول رقم ملتی تھی جب واپس
آتے تھے تو خوشحال ہو جاتے تھے مرغ تیتر بٹیر دونوں وقت پکتے ڈیوڑھی
پردوں سے بھری رہتی تھی کھانے میں اکثر شاگرد بھی شریک رہتے تھے۔
جب پیسہ ختم ہو جاتا تو وہی عسرت کا عالم ہو جاتا لیکن غیور اتنے تھے
کہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے نہ کسی شاگرد سے کبھی طالب ہوئے کبھی کوئی
چیز گروی رکھ دی یا بیچ ڈالی اسی سلسلہ میں اپنا آبائی مکان جو سرائے معالی خاں
میں تھا بیچ ڈالا اور تقوی ٹولہ میں کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے جہاں مرتے دم تک
رہے کسی حال میں ہوں فکر سخن سے غافل نہیں رہتے تھے اور مشق سخن جاری
رہتی تھی۔ پیتل کا جالی دار قلمدان سامنے رہتا تھا جس میں قلم دوات راجس
کا چاقو الائچیاں اور عطر کی شیشی ہوتی تھی۔

برجستہ گوئی۔ وہ بڑے برجستہ گو تھے شعر کہنے میں ان کو فکر کی ضرورت نہ تھی
غزلوں کی غزلیں اس طرح کہہ ڈالتے تھے جیسے باتیں کر رہے ہیں انھوں نے اپنی
بعض غزلوں کے مقطع میں اس کا ذکر بھی کیا ہے صفدر مرزا پوری ان کے
تلامذہ میں تھے انھوں نے ایک کتاب بزم خیال لکھی ہے جس میں ان
شعراء کا ذکر ہے جن کو انھوں نے دیکھا ہے جاوید صاحب
کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے کمال فن سادگی مزاج
اور برجستہ گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"جب میں لکھنؤ میں آیا یہاں کے اکثر شعراء کاملین فن سے ملتا رہا
جس وقت میں بندہ کاظم صاحب جاوید سے ملا تو جس قدر میں نے شہرت
سنی تھی اس کا کوئی اثر طریقہ بسر سے نہیں پایا۔

اتفاق سے ایک دن ساتھ سبزے کی سیر ہو رہی تھی کہ ایک صا

سیاہ شیروانی پہنے ہوئے نمودار ہوئے آپ نے کہا —— صبح سے شام تک اصلاحیں دے کے یہاں آیا تھا یہ بھی مرے ماتم میں سیاہ پوش ہیں انھوں نے قریب پہنچ کر فراشی سلام کیا اور شعر اصلاح کے لیے سنایا۔ جاوید صاحب سنتے جاتے تھے اور اصلاح دیتے جاتے تھے۔

اتنے میں ایک دوسرے صاحب نازل ہوئے انھوں نے ایک شعر اور ایک مطلع اصلاح کے لیے پیش کیا مطلع تو مجھے یاد نہیں رہا شعر یہ تھا۔ ؎

نہیں ہے اب کوئی جوان کو دیکھے ؎ حسیں اب کیا کریں سرمہ لگا کے

اصلاح

مرِ زینت خیال آتا ہے کس کا — حسیں رو دیتے ہیں سرمہ لگا کے

ایک دن جاوید صاحب میرے گھر سے جا رہے تھے پانی برس کے نکل گیا تھا راستے میں کیچڑ بہت تھی پاؤں کیچڑ میں پڑا اور چھینٹیں اڑیں مولانا عشقی اور عزیزی طرب ساتھ تھے آپ نے برجستہ کہا ؎

جو چھینٹ پاؤں سے اڑتی ہے سر پہ آتی ہے ؎ فلک کی طرح زمیں بھی ہمیں ستاتی ہے

۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق پندرہ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء کو انسٹھ برس کی عمر میں دو دن سانجر کے مرض میں مبتلا رہ کے انتقال فرمایا۔ جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا شہر کے تمام روساء علماء اور شعراء شریک تھے غفران مآب کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔

ہندوستان کے تقریباً تمام شعراء نے وفات کی تاریخیں کہیں کسمنتے آواز "طبتم فادخلوها خالدین" سے مادہ تاریخ نکالا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔

احباب و معاصرین:۔ ان کے احباب میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے جو

۱؎ بزم خیال مطبوعہ صدیقی بکڈپو امین آباد لکھنؤ ص ۱۲۵ تا ص ۱۲۷

ان کے بڑے قدر دانوں میں تھے جب لکھنؤ آتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے اور اکثر مصرع طرح بھیج کے غزلیں بھی منگواتے تھے ایک غزل کے مقطع میں جاوید صاحب نے اس کا ذکر بھی کیا ہے ؎

ایک ہی دن میں غزل بھیج دی کہہ کر جاوید — پاس تھا حضرت آزاد کے فرمانے کا

امیر مینائی ان کے اساتذہ کے ہمعصر تھے مگر ان سے برابر کا برتاؤ کرتے تھے اور اکثر غزلوں کی طرح بھیج کے ان سے غزلیں کہلواتے تھے اس کا ذکر بھی جاوید صاحب نے ایک غزل میں کیا ہے ؎

آپ جاوید بجا لا چکے ارشادِ امیر — طرح گر خوب ہو تو فکر بھی بیکار نہ ہو

ریاض خیرآبادی ان کے معاصرین میں تھے ان سے بھی عزیزانہ تعلقات تھے ایک مقطع میں اس کا ذکر بھی ہے ؎

یہ کہہ ریاض سے جاوید ہو جو ملیں کشش — کہاں وہ جائیں جو دوست لکھنؤ آ کے رہ گئے

محل ملانہ مجھے حشر میں جو نالوں کا ! — محال ہو گیا چہرہ ستانے والوں کا

کہیں کے بھی نہ رہیں گے جو لوگ جیتے ہیں — حضور غم نہ کریں آپ مرنے والوں کا

چپ رہوں گا تو ستائے گا مجھے دل میرا — کچھ کہوں گا تو مزاج آپ کا برہم ہوگا

پہلے تو اس نے قتل مجھے بے سبب کیا — اب ہاتھ مل رہا ہے کہ یہ کیا غضب کیا

کام اپنا اپنا سب کی نگاہوں نے کر لیا — [illegible] کی نظر نے یہ کیا غضب کیا

آئے ہیں کیسے غیر کو وہ پوچھنے مزاج — کیونکر کہوں کہ شکر ہے پروردگار کا

جہاں میں کوئی نہ معشوق تھا شباب ایسا — زمانہ یاد ہے اس بیوفا کا حجاب ایسا

نہ بار بار سرِ بزم آئینہ دیکھو ! — میں جانتا ہوں کسی کا نہیں شباب ایسا

یہ کس نے چاہنے والوں پہ سرگرانی کی — یہاں تک آتی ہے آواز لن ترانی کی

جو چھپنا ہے تو میری طرف سے پھیر لو منھ — یہ کوئی کھیل نہیں ہو تو رہے جدائی کی

انھوں نے دیکھے تسلی پہ کیا کیا اے ہجر ہمارے دل کو نہ پہلے تھا اضطراب ایسا
قدم قدم پہ ترے بس رہے ہیں دل بسکے نہ اکسی کو نہ عالم میں دے شباب ایسا
اب ایک نزع کی انکھیں تکے ہیں گھبرا دل ہزار بار ہوا ہوگا اضطراب ایسا

اس قدر چپ چپ نہ دیکھا تھا کبھی دیکھ کر تصویر کو پیار آ گیا
دے کوں کچھ خود ہی تسلی کے جواب حال کہتے کہتے دم گھبرا گیا
بات کھوئی عشق کی یہ تھا اے کلیم جس کی صورت دیکھ لی عشق آ گیا

عاشق کو ترے جی سے گذر نہیں آتا سب آتا ہے طبیعت کو مرنا نہیں آتا

یہ نکات تیغ ہے کہ ہیں دو داغ جگر میں اک ہجر کی شب کا ہے تو اک وصل کی شب کا

اب یہ حسرت کہ لاش بھی نہ اٹھائیں دل کو مرنے سے پہلے مرنا تھا
گئے اپنے لگایا انھیں جلتی جوانی نے مزاج اب آج سے کچھ اور ہے اس کا

ہے جن کو درد ہجر کے غم میں بسر کیے ہیں تڑپی جو موج ٹوٹ گیا دل حباب کا

دل سے رخصت ہو گیا خوف و خیال باز پرس مسکرا کر حال دل کا پیش اور کہہ دیا
یاد تھا پوری طرح افسانۂ ہجر و وصال کچھ گھٹا کر کہہ دیا اور کچھ بڑھا کر کہہ دیا

کوئی کہہ دے کہ جو آئے ہیں تو دم بھر بیٹھیں ایسی کچھ دیر نہیں ہے مرے مرجانے میں
نشہ آنکھوں میں بل ابرو پہ ہے اور یہ ہنسی ہے سلیقہ انھیں تصویر کے کھنچوانے میں

کسی دامن کی بھر کشش کو یاد کرتے ہیں ہم اپنے اشک اک امید پر برباد کرتے ہیں
بہت روئے ہیں قسمت کو جو ہم آباد کرتے ہیں جگر کے زخم پھٹ جاتے ہیں جب فریاد کرتے ہیں

جادۂ اتحاد عناصر ہے یادگار یہ اک سرا ہیں چار مسافر کہاں کہیں

یہ آرزو ہے کہ بڑھ جائے طاقت پرواز چھڑک رہا ہوں لہو بازوئے کبوتر پر

مسکرانا بھی اور انداز سا کھلتی کلیوں کو آ گیا کیونکر
عشق سے نہ پشیماں ہوں کلیم آپ سر طلب ہوتا ہے یہی عاشق دلگیر کا انداز

داستاں وصل کی چھیڑوں کہ شب فرقت کی لطف دو رنگ کے اور ایک ہے افسانۂ عشق
آمد کے دن کی خبر نکلی دھڑک رہی تھی بیٹھیے میں کبھی سنتے تھے جو افسانۂ عشق

الٹے یہ حشر ہے لاکھوں ہی میں کہ جن کا یہاں یہ ہم بھی نہیں راضی نقاب ڈال چکا

تمھیں ہے نشۂ جوانی کا ہم کو غفلت عشق نہ اختیار میں تم ہو نہ اختیار میں ہم

ہے مزاق عاشقی میں موت اک امر محال تم یہ جو مرتے ہیں ان کے دم نکل سکتے نہیں
وصل کے اقرار کے حشر میں نادم ہیں وہ اب یہ جلتے آج کے وعدے پہ ٹل سکتے نہیں

اتنی حسرت ہے کہ اے کاش اجل بھی آ جا ان پہ جو مرتے ہیں جینا انھیں منظور نہیں
وہ کیا خوب کہ لاش بھی ہم کر دو لڑ لیا جانتا ہوں کہ عزیزوں کا یہ دستور نہیں
ان کے کوچے میں کوئی دفن نہیں ہو سکتا اب کہوں خاک کہ جینا مجھے منظور نہیں
پاس آتے ہیں وہ ہمراہ رقیب لیے جاتے ہیں اب اگر آج اجل آئے تو کچھ دور نہیں

دیکھ ہی لیتے ہیں ان کے دیکھنے والے مجھے ان سے تو خود بھی سر محفل چھپا جاتا ہیں

سنبھالا بے خودی نے گر تو سنبھلے وہ سنبھالے ہیں نکلتے ہیں کبھی ہم نے تو یوں اور ان نکلے ہیں

ثابت ہے نہ کچھ ہوگا نگہ ان کی ہے نیچی اب کھینچیے تصویر وہ شرمائے ہوئے ہیں
اب جانے والوں کے کلیجوں کا خدا ہے آئی ہے جوانی تو وہ اترائے ہوئے ہیں
عشاق کی ضد سے وہ نگہ رکھتے ہیں نیچی بیدرد یہ سمجھے ہیں کہ شرمائے ہوئے ہیں
بلا جانے وہ خود دیکھ لو آنکھوں سے جنازہ ہم در پہ بری طرح سے آج آئے ہوئے ہیں

دامن کی وہ ہو دیں جو دیتے ہیں بار بار مطلب ہے اپنے ہم کو بھی عشق آ جاتے ہیں
رات کو دریا میں موجیں کس طرح سے چین لیں اک کنارے چاند ہے اور اک کنارے آپ ہیں
ہو نہ ہو قتل ان کی نزاکت سے کچھ کم کھینچی نہیں ہے ہاتھ سے تلوار کیا کریں
دیکھیں تو جان جائے نہ دیکھیں تو جان جائے آخر کسی کے طالب دیدار کیا کریں

شکوے جو کچھ کیے ہیں یہ تو ان کہ دیا ہے یا ہیں بنا رہے ہیں کچھ اس سے جوڑتے ہیں

کوئی ناخوش ریاض سے کیوں ہو — اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

بہت سکر سنا نہیں چھوٹتے ہی آنکھ دیکھی — کام کے جب سے پیدہ ترکم نہیں تو کچھ نہیں

کرن سورج کی نکلی جام سے — یہ سمجھا دھوپ سے چادر [illegible]

وہی ہم ہیں نہ چھوڑا ہاتھ میں نے کہا — وہی ہم ہیں کہ اب غمزے لیے۔ اور [illegible]

ہستیں جلانے میرے جاکے فلک پر جھک گئے — کچھ تو کم کچھ اور گئے سیارہ بھی

رنگ دل کا داغ تجب سا نہیں — اس چمن کا پھول مرجھاتا نہیں

چپ رہتے رہتے ہیں نقش قدم — تو کبھی آتا نہیں جاتا نہیں

سیر کو جلوہ گاہ طور کہاں — دیکھے پاس جائیں دور کہاں

ستر اٹھانے میں ساتھ دے سیر — گم ہوئی ہے صدائے صور کہاں

کوئی کبھی دل مجنوں کی پیاس نہیں سنتا — چمن کے تشنہ سر اپنی گات جلاتے ہیں

داور حشر سے کیا شکوہ بیداد کریں — ہاں نہیں آئی تو کچھ آپ فریاد کریں

حسرت ہوئی رسائی قسمت کو دو چکے — وہ سنگ در کہاں یہ ہماری جبیں کہاں

ساغر ہے آنکھ پڑ رہی ہے بزم غیر میں — کھل کھیلنے کو ہے نگہ سرمگیں کہاں

ٹوٹی ہے آنے کو پیمانوں میں آج اس — اب دیکھیں ٹوٹتے ہیں وہم [illegible] کہاں

رام ہے دست یار میں یاد ہے اللہ [illegible] — پھول آئے بہار میں پھل نے [illegible]

کس قدر گور غریباں کے ہوا افسردہ چراغ — جس قدر ریز کرہ اور بجھے جاتے ہیں

فرحت سبزہ کو ہو ہی جاتی ہے لغزش — مستی رہی بہار دیکھ رہے ہیں

دیکھا نہیں ہم نے ابھی دنیا کا بدلنا — بدلی ہوئی دنیا ہوا دیکھ رہے ہیں

کشتہ طور ہے جو موج ہے پیمانے میں — بجلیاں کوندتی ہیں آج مرا میخانہ نہیں

الگ ہے خدا سے کچھ ساخت ان کی — یہ بت اور سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں

دل تو ہے کیونکہ کہوں پہلو میں میرے نہیں — ہے وہی محفل مگر اب گرم محفل نہیں

نوبت رائے نظر

تعارف:۔ لکھنؤ کے کالستھ علم و فضل میں فخر لکھنؤ ہیں ان میں ایسے ایسے ادیب و شاعر پیدا ہوئے جن کا مثل مشکل سے ملے گا ان میں ایک منشی نوبت رائے نظر بھی تھے یہ کالستھوں کے پرانے خاندان سے تھے ان کے آبا و اجداد سلاطین اودھ کے یہاں معزز عہدوں پر فائز تھے۔

منشی نوبت رائے نظر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اردو فارسی اور انگریزی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے شاعری کا ابتدا سے شوق تھا آغا مظہر لکھنوی کے شاگرد تھے شاعروں میں لکھنؤ کے اساتذہ سے ٹکر لیتے تھے بڑے بڑے شعرا ان کے کمال کے معترف تھے ایک رسالہ خدنگ نظر بھی نکالتے تھے ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔

گردش دھر بھی ایک گردش بیداد ہے — ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ مستانہ ہے

اک طبیعت کی اداسی کا اثر اتنا ہے — ساری دنیا نگہ یاس میں ویرانہ ہے

حالت محفل عشرت ہے رقم سب اس میں — ایک رقم کے برابر یہ پروانہ ہے

پر تو مہر کجا ذرہ ناچیز کجا — کیوں یہ دل حسرتی جلوہ جانانہ ہے

تیرے ملنے کی وہ تقریب ہے پیدا ہونے — جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہوا افسانہ ہے

نظر اب چل کے کرنا چاہیے آباد مرقد کو — بہت ہے منتظر اپنی زمیں گور غریباں کی

موت سے کیا ساز کر کھا ہوا اس نے اے نظر — مدتیں گذریں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

یاس و ناکامی سے ہے جوش قلب مضطر ہو گیا — اب ترا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

وہ نگاہ سرمگیں ہو یا کسی کا انتظار — جھک کے جو مجھ سے ملا وہ ایک خنجر ہو گیا

اس سے بڑھ کر اور کیا ہے سادہ لوحی خوش — آپ نے وعدہ کیا اور مجھ کو باور ہو گیا

خاک رہی کی جو حاجت تھی تو آخر اے نظر — خاک میں ملنے کے قابل جسم لاغر ہو گیا

جلیل حسن جلیل

تعارف: ۱۸۶۶ء میں مانک پور اودھ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور ماحول شاعرانہ تھا۔ ان کا ذوق شعری پروان چڑھا۔ امیر مینائی کے شاگرد رہے۔ ان کے بعد نظام حیدرآباد کے استاد ہوئے۔ [illegible] میں انتقال ہوا۔

فغاں میں درد، دعا میں اثر نہیں آتا
جو تم نہیں ہو تو کوئی نظر نہیں آتا

شراب عشق کی مستی عجیب مستی ہے
گیا جو ہوش تو پھر عمر بھر نہیں آتا

رنگ گلاب کی کلی کا !
نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی
یاد آگیا روٹھنا کسی کا

دیکھو نہ جلیل کو ستاؤ
مٹ جائیگا نام عاشقی کا

کوئی حسین ہو بس اک نگاہ کر لینا
جگر کو تھام کے بیٹھے سے آہ کر لینا

نیاز مند ہوں کافی ہے اثر گریے کو
سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا

کوئی ستم تو نہیں یہ کہ درد دل کہنا
اثر کرے نہ کرے تم کو آہ کر لینا

موسم گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے !
شمع کا داغ جگر خون ہو پروانے کا

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی !
کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

جب سے عشق کا پھندا مری گردن میں لیا
پھر پڑا رہے قفس میں کہ نشیمن میں لیا

دل آرام کی خاطر رہے دنیا میں خراب
اور آرام چھپا گوشۂ دامن میں لیا

چاک دامانیٔ یوسف تو کوئی بات نہ تھی
ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں لیا!

قیس و فرہاد کا بھرتے رہے بہروپ جلیل
یہی سودا تھا، یہی کھیل لڑکپن میں رہا!

دامن سے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار
اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا

آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیل
اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

یار تک پہنچا دیا بیتابیٔ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ ممکن ہے
میں جلوں اور کلیجہ رہے ٹھنڈا تیرا

روئے رنگیں پہ پسینہ کا عجب عالم ہے
آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا

وہ شوق بھرا دل تھا حسرت سے تڑپ اٹھا
ثابت نہ ہوا مجھ پہ ناوک کا خطا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ، ہاں اتنی گزارش ہے
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

برا نہ مانو اگر ذکر حور میں نے کیا
غرور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا

اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور سمجھو
تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

منتظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں

واعظ چھیڑو نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پئے بیٹھے ہیں

دست وحشت کو خبر کر دے کوئی
ہم گریباں لئے بیٹھے ہیں

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں
کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں

ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ؟
برہمن کیا ہم ابھی پیش خدا کہنے کو ہیں

ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل
جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

رو آنکھ چرا کے جانے والے
ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں
وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دور

علی نقی صفی

تعارف:- علی نقی نام صفی تخلص ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں انتقال ہوا ان کی شاعری کی عمر ۷۵ سال ہے حقیقت میں یہ دور سوم کے شاعر ہیں مگر ایک مدت تک بحیثیت شاعر کے نمودار نہیں ہوئے دور چہارم کے شعراء کے ساتھ نمایاں ہوئے اس لئے ہم نے ان کو دور چہارم میں رکھا ہے۔

تو کبھی سا اور بھی مشتاق میرے انداز میں ہے — جب تو یہ درد بھیجے تری آواز میں ہے

بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج ہے — کل بیٹھیا پہلو سے میرے شیشہ دل رہ گیا

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بادل گرجا بجلی چمکی روئی شبنم ہنسے پھول — مرغ سحر کی سحر کی شب کے افسانے ختم ہوئے

جام چھلکے ساتھ گردش میں پیمانہ آ گیا — آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آ گیا

گل کی آمد میں بہار کی تصویر دکھا کے — کارواں عمر رفتہ کے نشاں دکھلا کے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے — آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے

وہ اور کچھ نہ سہی لطف انتظار تو ہے — کہ غیر کو ترے ملنے کا اعتبار تو ہے

رہا ہاں بادہ ہی کبھی ہو میں غم نکلتا ہے — یہاں اک گرتے گرتے کچھ کر سہارا دم نکلتا ہے

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے — شب فرقت غم جیسا ہو ویسا دم نکلتا ہے

چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہ خدارا چھیڑو — آنسو آ کے تھے نہیں بھرے نے میں تصویر سمجھ

پر تو لیتے ہی مصیبت کہ گرفتار ہو گئے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے

راہ عمل میں نفس کی لغزش سہا نہ گیا — رشتہ ایک ذرا رنگ دیوانہ ساتھ

لے کے میخانے میں چلتا ہوا میخانے کو — ایک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو

کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی — رکھ لوں پیش دل میں اٹھا کر ترے میخانے کو

دم زینت انھیں کیا جانئے کیا یاد آیا — آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو

ہے سبق یاد دو عالم کی فراموشی کا — ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے پلائے ہوئے ساغر — رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو

وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو — اب کیا جواب دیں نگہ انتظار کو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی — کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

آتے آتے ان کو آئے گا خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

بے سبب اپنی جگر کاوی نہیں — عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی

فصل گل آئی جنوں اچھلا جلیل — اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے — دشت مجنوں میں بہار آئی ہے

باغ ہستی سے بہت دور تھے ہم — بو کسی گل کی اڑا لائی ہے

داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو — وہ چراغ شب تنہائی ہے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے! — دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے

یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہئے! — ہوئے دامن تو جدا دیدۂ تر سے پہلے

شام غربت کا فسانہ نہ ابھی چھیڑ طویل — پوچھ لوں حال وطن باد سحر سے پہلے

کہہ گیا آج وہ بیدرد گلے مل کے جلیل — ہم نہ واقف تھے ترے درد جگر سے پہلے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے — فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے — جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

اچھا ہے وہ جو مجھ کو پھرا لائے ہیں صیاد — آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے

سیر چمن کو آپ گئے تھے یہ گل کھلا — پھولوں میں آگ لگ گئی برق نگاہ سے

کیا بتاؤں ابتدائے عشق کی مجبوریاں لاکھ سمجھایا دل خانہ خراب آ ہی گیا

لکھ لیا سب قصہ بربادی عمر عزیز کیا کلیجہ تھا ہمارے کاتب تقدیر کا

کیا آپ نے بھی ہجر کے بیمار کو دیکھا سینے میں دعا مانگتے اغیار کو دیکھا
اب زندگی و موت تذبذب میں پڑی ہے کیوں نزع کے وقت آپ نے بیمار کو دیکھا
اب چھپنے لگے یہ خون بھری تیغ چھپنے لگے کیا سوچتے ہیں آپ جو ہونا تھا ہو گیا
عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا
ذرے ذرے میں تموج دونوں عالم مضطر وہ بھی کیا تھا وقت جب عاشق کا دل بیتاب تھا
دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھے تیرے ہر انداز کو چھپ کر کوئی دیکھا کیا
پیمان حشر کی حقیقت اتنی سمجھ رہا ہوں دونوں جہاں ہوں گے ان کا شباب ہوگا
سینہ میں ایک جہنم آنکھوں میں ایک طوفان کیا جانتے تھے ہم کو جینا عذاب ہوگا
ہستی ذرہ دل میں دنیا لئے ہوئے ہے یہ کبھی کوئی ہمیں ساخانہ خراب ہوگا
مجھ سے قاتل کی ندامت تو نہ دیکھی جائیگی جی میں آتا ہے بتادوں روز محشر کا ہوا
میں اور اپنی زیست سے مایوس ہو گیا جب رو دیا مجھے کوئی غمخوار دیکھ کر

وعدہ کیا تھا پھر بھی نہ آئے مزار پر ہم نے تو جان دی تھی اسی اعتبار پر
اٹھنے کو تیرے در سے اٹھا تو مگر نہ پوچھ جو کچھ گذر گئی دل بے اختیار پر

کہا محاسب رحمت نے لیکے فرد حساب یہ مشغلہ ہے شب ماہتاب کے قابل
شراب عشق سے چھلکا جو دل کہا میں نے یہ جام تھا کسی مست شباب کے قابل
فضائے وسعت دنیا ہے تنگ آنکھوں میں جگہ نہیں دل خانہ خراب کے قابل

آئے ہیں اس ادا سے کسی کے جلوہ زار میں بجلی چمک رہی ہے دل بیقرار میں
ہر چند ضبط باعث اخفائے راز ہو یہ بات اب نہیں ہے کسی اختیار میں
پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا ہوتا اگر یہ دل ہی کسی اختیار میں

ناصح تری نصیحت بے جا بجا سہی کیونکر دکھاؤں تجھ کو کلیجہ نکال کے
وادی عشق میں بہلائیں کہاں دل اپنا ہر طرف رونے کی آواز چلی آتی ہے
ہم کسی فکر میں وہ اپنی کہے جاتے ہیں سچ ہے ناصح کو بھی کیا درد سری آتی ہے

سچ تو یہ ہے کہ جوانی میں کسے ہوش رہا میں نے اپنا وہ زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے
ان کو سوتے ہوئے دیکھا تھا دم صبح کبھی کیا بتاؤں جو ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے

جس کے مرنے کی ہو خوشی تم کو ایسی میت پہ کون روتا ہے
کوئی عالم میں سو نہیں سکتا بیخبر یوں بھی کوئی سوتا ہے
بجلی چمک کے ہی تھی یہ تمہید امتحاں پردہ سرک رہا تھا کہ بیہوش ہو گیا
کیا دیکھتا ہوں کون یہ بیٹھا ہے میرے پاس میں میں بے ہوش میں ہوں کہ بیہوش ہو گیا
ابر میں اور بجلیوں کی لہر میں کھوئی ہوئی بال بکھراتا ہوا انگڑائیاں لیتا ہوا
دنیا کو وہ لوٹ دل ناشاد سے ہوا یہ طول اس خلاصہ ایجاد سے ہوا
ہے یہ حقیقت عدم و عالم وجود وہ خامشی سے یہ مری فریاد سے ہوا
رحمت نے بڑھ کے سرد جہنم کو کردیا کیا قصور یہ دل ناشاد سے ہوا
ناواقف رسوم محبت ہے کوئی چیز انسان عزیز شیوہ فریاد سے ہوا
لب تک اس کا نام آجاتا ہے اب بے اختیار بات کرنا بھی اسی ڈر سے بہت کم کردیا
ذرہ ذرہ خاک کا میری کہے گا داستان آپ سمجھے ختم میں نے قصہ غم کردیا
آپ کہتے کیسے بنائیں گے خدائی ہم الگ سیکھئے دل نے وہ ساماں بھی فراہم کردیا
دل کے اجزا سے نہیں ملتا کوئی جزو نشاط اس صحیفے سے کسی نے اک ورق کم کردیا
کردیا انکار ازل میں سب سے ہر دل گیر نے وہ مری قسمت میں لکھا کاتب تقدیر نے
موت سے پہلے لکھا تھا میں نے ان کو خط کردیا ہنگامہ اس حسرت بھری تحریر نے
دونوں ہاتھ اس نے ملا کر اس طرح انگڑائی کی مار ڈالا کھینچ کے وہ مری یاد علا کی تصویر نے

مجھ کو کافر ہی سمجھتے یہ خدا کے بندے
فاش اگر پردہ اسرار محبت کرتا

تیرا اندازہ رحمت جو بیاں کر دیتا
کوئی دنیا میں نہ پھر تیری عبادت کرتا

جتنی مصیبتیں تھیں وہ لکھ دیں گئے یہاں
بس ختم سعی کاتب تقدیر ہو گئی

دل کو جلا کے دولت جاوید پا گیا
اتنی سی بات مایہ اکسیر ہو گئی

اے سعی نامراد بتا کیا جواب دوں
تقدیر پوچھتی ہے کہ تدبیر ہو گئی

ہاتھوں سے میرے دامن رحمت چھڑا لیے
ہاں ہاں یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی

تیرا پرتو جو نہیں جلوہ فروز
ذرہ ذرہ میں چمک کیسی ہے

ہے طلسم تصور تو اب قدم بہکیں
کہ ذرہ ذرہ پہ تصویر یار رہ گئی

مگر کوئی حالت بیمار فرقت ہو گئی ہوتی
اگر دم بھر نہ آتے تم قیامت ہو گئی ہوتی

سر محفل تو کس گرم تعلیم محبت ہے
یہاں ہوتے تو ناصح کو نصیحت ہو گئی ہوتی

بتا تا کہ کسی سے نہ کرونگا میں کوئی بات
چھپتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر بھی

یہی کہہ کہہ کے ہیں منزلوں کی ہمت افزائی
کہ اب آتا ہے اب دل اب یہ جانا آتا

وہ دل ایسا کون دل ہے کہ جسے قرار آئے
یہ جوانی آف جوانی کہ خدا کو پیار آئے

مزا اور مزے دیکھوں نگ میں نئی طبیعت کا
یہی تدبیر اب باقی ہے قسمت آزمانے کی

بزم میں یہ ادا ہمیں سمجھے !
سب کو دیکھا ادھر نظر نہ ہوئی

ہم اسی زندگی پہ مرتے ہیں
جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی !
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کریگا اگر سحر نہ ہوئی

ہوتا نہیں ہے کوئی زمانہ میں کیا جوا
اللہ کوئی حد ہے تمہارے غرور کی بھی

دیار عشق میں اللہ رے دل کی ہمدردی
ہر اک افسردہ دل کے ساتھ تھوڑی سی [illegible]

دم توڑتا نہیں کوئی بیمار اس طرح
شاید شریک موت کسی کی ادا بھی

کس قدر ہے نالہ میرا دلخراش
سننے والوں سے سنا جاتا نہیں

بجلی سی تھا ایک سامنے آ کر نکل گئی
کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

شوق دل بڑھ گیا ہے حد سے سوا
فاصلہ گھٹ گیا ہے منزل کا

جیتے ہیں کیسے ایسی مثالوں کو دیکھئے
پردہ اٹھا کے چاہنے والوں کو دیکھئے

اب بھی اس ایسے لوگ کہ جن سے ملے سبق
دل مردہ ہے تو زندہ مثالوں کو دیکھئے

بتاؤں کیا کہ میرے دل میں کیا ہے
سوا تیرے تیری محفل میں کیا ہے

نزع کا وقت ہے بیٹھا ہے سرہانے کوئی
وقت اب وہ ہے کہ مرنا ہمیں منظور نہیں

دل میں سو ہو ہی بھی جو میرے روز ازل
ہے وہی شوخ نظر صاعقہ طور نہیں

صیاد سر حق سے کیا کس نے سرفراز جہاں
اپنے عالم میں ہیں تیرے دیدہ مخمور نہیں

امیدوار وصل کو ان کا جواب صاف
ایک تیر تھا جو توڑ کے پہلو نکل گیا

یاد ہے پہلے پہل بجلی گرانا یاد ہے
آپ کی جب مہربانی تھی دل ناشاد پر

چمن کی سیر میں مقصود دلبستگی اپنی
خبر کیا تھی کہ ہر غنچہ کو ہم دلگیر دیکھیں گے

یہ اعمال کاتب اعمال لکھ لیں گے مگر قصے
مگر کچھ حال دل ناقابل تحریر دیکھیں گے

زمیں شق ہو فلک ٹوٹے پہاڑ آپس میں ٹکرائیں
مگر ہم آج زور نالہ شبگیر دیکھیں گے

ذرے ذرے کو بنا دیجے کسی دن مشرق
مہر افروز تجلی ترے رخساروں کی !

آکہ سامان تجلی کی کمی پوری ہو !
بزم آراستہ ہے چھپتے ہوئے تاروں کی

ساز دل کو عشق کی مضراب ہی کافی نہیں
آپ کی آواز اس پردہ سے آنا چاہیے

میرے دل میں کوئی ہمراز اور ہے
سن رہا ہوں ایک آواز اور ہے

شام فراق ذکر جوانی میں کٹ گئی
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

دیدار کا لطف اے دل بیتاب دیکھتا
ہر جلوہ مستانہ جہاں چین بجبین تھا

تھی آپ کے آنے کی تمنا ترے دل میں
مفہوم قیامت کا مگر ذہن نشین تھا

مرزا ذاکر حسین ثاقب

تعارف:- ۱۸۶۹ء کو آگرے میں پیدا ہوئے ۱۸۹۸ء سے لکھنؤ میں مستقل سکونت رہی وہیں ان کے ذوق شعری کی تکمیل ہوئی اور وہیں سنہ میں انتقال ہوا۔

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی
ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا

سنائیں کیا تمھیں نیرنگ عشق کا قصہ
تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہل دہر کو
بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا

نہ دم لے اے شریک غم تجھے قسم ہے عشق کی
فلک کو چھوڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا

رہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ جی
مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سمجھ چکا

یہ آشیانہ بہ ستم چمن میں ہو تو خوب ہے
یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس تو میرا ہو چکا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے اُبھرا کیا حسن
ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر سہی
مجھ پہ احسان تری آئی ہوئی انگڑائی کا

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا
میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا

اُن کی بزم میں نہ زیست سانس بھی دل نے لی
نالہ کش برسوں کا اک تصویر بن کر رہ گیا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر
یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا!
بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

میں دنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں
کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا

شب غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو
جدھر دیکھتا تھا، خدا ہی خدا تھا

مری داستان غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

کوئی بات ہے جو دل میں ترا تیر جم کے بیٹھا
نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا

وہ حکایتیں جوانی کی میں سن رہا ہوں دل سے
جنھیں اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

تجھے اوروں کی خاطر چھوڑ جاتا ہوں میں اے غربت
مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا

مرا دل محرم اسرار حسن و عشق تھا ثاقب
قرین مصلحت تھا مجھ کو دیوانہ بنا دینا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

متاع عشق کا ہو دل کے بعد کیا سودا
کہ گم شدہ کا بھروسہ نہیں ملا نہ ملا

اُس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر
رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

تڑپوں تو راز کھولوں سنبھلوں تو عشق ناخوش
جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

سلسلۂ ذکر جنوں کا آج تک باقی ہے کیوں
ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا

صبر عالم کے لئے کچھ چھوڑ دے دست جنوں
اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

مجھ کو یقین وعدۂ فردا ضرور تھا
مشکل یہ آ پڑی تھی کہ دل ناصبور تھا

جو آنکھ ہو تو دیکھئے نہ پوچھئے کہ کیا گیا
چراغ بزم ہو گیا جلا کیا ہنسا کیا

کیا دیکھتا آثار سحر میں شب فرقت
وہ جوش پہ آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابر سیاہ جانب گلزار دیکھ کر!

سمجھے ہیں دل لگی مری شام فراق کو
اچھا یوں ہی سہی مگر اک بار دیکھ کر

تیرے ہوتے گل گلشن کو میں دیکھوں توبہ
ابھی ایسی تو نہیں قوت تسخیر بہار

میں تو میں گل بھی ہوئے جامہ دری میں مشغول
سب کو دیوانہ کئے دیتی ہے تاثیر بہار

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں
اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر

میری طرح سے حال مرا اُن کا خیر خواہ!
عاشق ہے اُن کی نیند مری داستان پر

آزار عشق سے کہیں گھبرا نہ جائے دل
آنے لگی ہیں یاس کی باتیں زبان پر

قابو میں دل نہ ہو تو غزل کیا کہے کوئی
فرمائشیں عذاب ہیں ثاقب کی جان پر

غنیمت ہے قفس فکر رہائی کیا کریں ہمدم
نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

خدا آباد رکھے ہم صفیران گلستاں کو
جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

میں ہی اے حسرت نہیں محو جمالِ یار رہ گئے ۔ پڑ رہی ہیں سب نگاہیں اُس پہ شیدایانہ آج

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے ۔ شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں تک نہیں آتی ۔ مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اب تو اُٹھتا ہے یہی جی میں کہ اے محو جفا ۔ کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ جفا ۔ تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

حال کھل جائیگا بیتابیٔ دل کا حسرت ۔ بار بار آپ اُنھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

لطف کی اُن سے التجا نہ کریں! ۔ ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

مل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے ۔ لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں

صبر مشکل ہے آرزو بیکار ۔ کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت ۔ اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے ۔ وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد ۔ ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد ۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ ۔ تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے ۔ ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

اُس بے وفا سے مصلحتِ شوق ہے یہی ۔ اپنی ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجئے

منظور ہے جو ترکِ محبت ہی آپ کو ۔ ہم پہ ہجومِ ناز و ادا بھی نہ کیجئے

حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بت کے عشق میں ۔ تو چاہتا ہے یادِ خدا بھی نہ کیجئے

نہ ہے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب ۔ وہ ابتری جو تری زلفِ پُر شکن میں ہے

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات ۔ سُنے نہ کوئی، مرے دل میں یا دہن میں رہے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن ۔ آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے اُنھیں ۔ کہتے بنا نہ کچھ تو وہ قسم کھا کے رہ گئے

جامہ زیبی نہ پوچھئے اُن کی ۔ جو بگڑنے میں بھی سنور جائے

شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے ۔ جو تری یاد میں گزر جائے

گریۂ شام سے تو کچھ نہ ہوا ۔ اُن تک اب نالۂ سحر جائے

شعر دراصل ہے وہی حسرت ۔ سُنتے ہی دل میں جو اُتر جائے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے ۔ دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھے میں اپنے عشق سے ۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

صحبتیں لاکھوں ہی بیماریٔ غم پر نثار ۔ جس میں اُٹھے بارہا اُنکی عیادت کے مزے

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں ۔ آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو ۔ ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی ۔ اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا ۔ سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل ۔ گریۂ مشتاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

پہلے آنکھیں ہوئیں گردیدہ پھر آنکھوں کی طرح ۔ چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی

کہیں وہ آکے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف ۔ کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی ۔ تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل ۔ ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

شرح بے مہریٔ احباب کہوں کیا حسرت ۔ رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں ۔ کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی ۔ تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل

عہدِ یک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گزرا ۔ وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

انور حسین آرزو

آرزو جوش طبیعت کو ہے آزادی پسند، ہم نہ غالبؔ کے مقلد ہیں نہ پیرو میرؔ کے

تعارف :- ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے ۔۔۔ میں کراچی میں انتقال ہوا۔ جلال کے شاگرد تھے۔ شاعری میں تو پایہ بلند تھا ہی زبان کے متعلق بھی انھوں نے ایسا کچھ لکھا ہے جو دوسرا نہ لکھ سکا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تابع شوق بھی ہیں ہم ان کے بھی ہیں اجارہ
سوچ کے خط میں کچھ لکھا آپ ہی خود مٹا دیا

اتنا بھی بار گلشن خاطر نہ ہو کوئی
ٹوٹی وہ شاخ جس پہ مرا آشیاں بنا

وحشت ہم اپنی بعد فنا چھوڑ جائینگے
اب تم پھرو کیے چاک گریباں کیے ہوئے

جوش جنوں میں ان سے وحشی کا کھینچنا
بندھا ہے ہاتھ سے در زنداں کھلے ہوئے

مجھے بس چھوڑ میرے حال پہ اے شرم رسوائی
وہ دامن چاک کر بیٹھا ہو جس نے [illegible] پہچانا

زبان آرزو اور ماجرائے عشق کیا کہنا
فقط بے قدر ہے اس سے کہ جھگڑا [illegible]

کچھ بات کہی ہم نے نہ کچھ اس نے سنی ہے
چتون سے ہے کہ تلوار لئے سر پہ کھڑی ہے

رہیے دو ہی ہم اپنی کچھ سنبھل چلیے دل لوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہو گیا ہے جب ہاتھ سے دل چھوٹ گیا

جس نے یہ حالت بنائی وہ بھی آج اے آرزو
چہرہ بیمار سے چادر ہٹا کر رو دیا

کہنے کی بات ہی نہیں آ کہیں تو کیا کہیں
لب پہ ہے کس لئے سکوت بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوئی
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

چونک اٹھی ہے اک دنیا چیخ اٹھا ہے اک عالم
گھبرا کے اکیلے میں جب اس کو پکارا ہے

اور اسے بل تیوری پہ لانا بجا کہہ کے مسکرانا
شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے انکو بھی [illegible]

کچھ کہتے کہتے اشارے میں شرمائے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ کہنا نہ تھا جو سب سمجھ کر جانا

موج لے ڈوبی عمر کی کشتی
آج پایا نشان ساحل کا

عادی بنا کے لذت آزار نے مجھے
غم کی خلش کو دل کی تمنا بنا دیا

جو سینے میں دل ہو تو بار محبت
اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑیگا

وحشت انگیزی میں یکرنگی گریباں گیر تھی
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش
ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارے ٹوٹے

بدلی کی چھاؤں سی ادھر آئی ادھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

بڑے مزے کے تھے الزام گرچہ جھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا اسی فسانے کا

جیسی جس کی طینت ہو گی ویسا ہی بت کو بنا دیگا
داغی آئینہ جب دیکھو دھبا منہ پر آئیگا

رسوائی مزید کا امکان نہیں رہا
ان دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

شرح بربادی دل مجھ سے نہ پوچھ
ہے ترا حسن سراپا موجود!

ہے نگاہ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو اپنے اپنے آشیاں کے ہوشیار

امنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک میں ہم کو گئی بہار کہاں

ان کی بے جا بھی سنو آپ بجا بھی کہو
آخر انسان ہوں میں بھی کوئی دیوار نہیں

کہی چاک ان کے ہاتھوں کے، کچھ آنسو اپنی آنکھوں کے
دیا ہے جو مقدر نے لئے بیٹھا ہوں دامن میں

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

پردہ کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی
جو دیکھنا تھا اہل نظر دیکھتے رہے

لپٹی ہوئی دستار کو بھی سر سے اڑی ہے
وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اڑی ہے

افشائے راز، کشتان وفا، امتحان صبر
آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کیے

اسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نا محدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لیے

تھا ہمیں ذکر وفا پہ آہ کرنا کیا ضرور
سادگی دیکھو کہ دل کا راز خود افشا کیا

ہر سانس ایک شعلہ ہے ہر شعلہ ایک تڑپ
کیا تو نے مجھ کو اے طپش دل بنا دیا!

اس شان عاجزی کے فدا جس نے آرزو
ہر ناز ہر غرور کے قابل بنا دیا

اشکوں سے راز کھلتا کیا خون آرزو کا
آنکھوں تک آتے آتے رنگ اڑ گیا لہو کا

دنیا میں کشمکش کی کوئی انتہا بھی ہے
جبرِ مقدرات بھی قیدِ وفا بھی ہے

کیسا ہراس شورشِ طوفاں سے ناخدا
تو ہی نہیں محافظِ کشتی خدا بھی ہے

چھوڑا رہِ طلب میں جو امید نے تو کیا
میرا رفیق اک دلِ بے مدعا بھی ہے

ساقی ادھر نگاہ تو کر جام دے نہ دے
اس تیری بزمِ عیش میں اک بے نوا بھی ہے

کچھ تو ازل سے روح و محبت میں ربط تھا
کچھ کارسازیِ دلِ درد آشنا بھی ہے

کیا شانِ کردگار ہے ضدین جمع ہیں
عشق ایک دردِ زیست بھی ہے اور دوا بھی ہے

تسکین یاس میں ہے مگر یاس ہی کہاں
مانیؔ ابھی تو حشر کا اک آسرا بھی ہے

دعوائے عاشقی بجا ہے لب پہ گلا بھی ہے
حالانکہ شرطِ عشق و محبت وفا بھی ہے

تقدیر نارسا بھی دلِ مبتلا بھی ہے
شکرِ خدا لبِ گلہ نا آشنا بھی ہے

آسانیاں کہاں رہِ پُرخارِ عشق میں
رہرو کا یار دوش اگر مدعا بھی ہے

پاؤں کا دادِ غم یہ فقط آس ہی نہیں
دل کو یقینِ وعدۂ صبر آزما بھی ہے

اک میرا آشیاں نہیں باغ ہے وہی
گل بھی ہیں بوٹے گل بھی روشِ صبا بھی ہے

تفریح کیلئے کہوں کیا داستانِ غم
تم کو دردِ دل پہ ذرا اعتنا بھی ہے

چاہے ہے یہ یقین ہزار ہوں گا نزوں
یعنی کہ مدعا بھی نہیں ہے دعا بھی ہے

دشوار ہو کہ سہل یہی ایک راہ ہے
دنیا میں زندگی کے سوا راستا بھی ہے

قادر امتحاں ترا آئی یہ وہم کیوں
بزمِ وفا میں کوئی تجھے پوچھتا بھی ہے

مے سے توبہ حرام ہے اب تک
دستِ ساقی میں جام ہے اب تک

موت کیا ختم کر سکی قصۂ غم
داستاں ناتمام ہے اب تک

کس کا اک حرف تھا وہ صبحِ ازل
وہی زورِ کلام ہے اب تک

واعظا حیف بھی رہ کر بیں مرے
مجھ کو ترا احترام ہے اب تک

پہلا مٹا حسن کی روش پہ عشق
شورِ محشر حرام ہے اب تک

جلوہ یونہی رہے گا نا محدود!
جس طرح ناتمام ہے اب تک

ابھی کافر نہ کہیے مانیؔ کو!
قصدِ بیت الحرام ہے اب تک

جنوں مجھے تو کوئی داد ہوش کی نہ ملی
وہ بے خودی بھی گئی اور آگہی بھی نہ ملی

کہاں وہ خلوتِ راز انتہائے راہِ نیاز
سر اپنے سہم کو تو راہِ نیاز ہی نہ ملی

تو کیا ہوا جو کٹی زیست وقفِ غم رہ کر
جوان کارِ خم ہے وہ فسردگی نہ ملی

ہزار سادہ نو سلیقے ہیں بے فانی کے
وفا کے رنگ میں تصویرِ آدمی نہ ملی

سوائے عظمتِ آفاق کیا ہے اس کیلئے
جسے تمہاری تمنا سے روشنی نہ ملی

کچھ اپنے بس میں نہیں ہے قیدِ وجود سے چھٹنا
یہیں تو سعی سے راہِ فرار بھی نہ ملی

رہِ حیات میں کافی سمجھ رفاقتِ غم
خوشی کا ذکر ہی کیا ہے ملی ملی نہ ملی

کبھی ادا نہ ہوئے ہم سے آستاں کے حقوق
جبیں ملی بھی تو شایانِ بندگی نہ ملی

ہے دامنِ حقیقی یہ خم ہے سرِ مانیؔ
جہاں میں اور کہیں جائے امن ہی نہ ملی

حاصل نہ ہیں یاس وہ بتّا ہے ان دنوں
ہر ادعا سوچ مقصد دل دکھا ہے ان دنوں

منزل کے پاس عشق جلا پایا ہے ان دنوں
دل میں بھی عزمِ ترکِ تمنا ہے ان دنوں

تکلیفِ ضبطِ راز گئی ساتھ ہوش کے
الفت جنوں کی شکل میں رسوا ہے ان دنوں

دیوانہ ہوں خزاں میں بھی آ دیکھ اے بہار
یعنی ترا جنوں تمنا ہے ان دنوں

یہ غم ہے جس جہاں میں وہیں عیش بھی تو ہے
دامِ فریب پہ نظر پا ہے ان دنوں

امید اب تو ہے کہ بھر آئیگا زخمِ دل
توفیقِ شکر صرف مداوا ہے ان دنوں

مانیؔ جو وقت بیت گیا اس کو بھول جا
یہ بھی تو وقت ہے جو گزرتا ہے ان دنوں

محویت یہ ہو کہ پھر ہوش میں آ ہی نہ سکوں
سر ترے در پہ جھکا دوں تو اٹھا ہی نہ سکوں

غم کو انداز تبسم میں دکھا ہی نہ سکوں
یہ تو شکوہ نہیں لب تک جسے لا ہی نہ سکوں

سجدے کرتے ہیں مجھے ورنہ ترا نقشِ قدم
نقشِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا ہی نہ سکوں

لکھنؤ کی غزل کا ایک اور طرز

(سلام)

لکھنؤ میں غزل کی ایک قسم سلام بھی ہے۔ میر انیس نے اپنے نواسے رشید صاحب سے کہا تھا کہ ہماری غزل ہمارا اسلام ہے۔

محمد جعفر صاحب اؤمید نے غزل میں جو اصلاح تجویز کی تھی یعنی رندی و شاہد پرستی کے مضامین واعظ ناصح کی تضحیک، حضرت خضر کی عمر حضرت عیسیٰ کا معجزہ، حضرت یوسف کے حسن کی تشبیہ سے اجتناب، معشوق کو حالت طلاق میں گھٹنا اسی کو حالی نے اپنے نام سے مقدمہ شعر و شاعری میں اصلاح غزل کے عنوان سے پیش کیا تھا مگر وہ دونوں اس رنگ میں اچھے شعر نہ کہہ سکے اور یہ اصلاح مردود و متروک ہو گئی مرثیہ گویوں نے اسے معراج کمال تک پہنچایا انھوں نے سلام کو غزل بنا لیا ۔ ابتدا میں سلام کی وضع یہ تھی کہ مطلع بحر کی سلامی سلام یا السلام سے شروع ہوتا اور مقطع تک فضائل و مصائب کی کی فضا قائم رہتی تھی مرثیہ کی ترقی کے ساتھ سلام کو بھی ترقی ہوئی مطلع میں سلامی یا سلام شاذ و نادر رہ گیا اور غزل کے مضامین سوائے رندی و اوباشی کے داخل کر دیے دو ایک شعر واقعہ کربلا کے متعلق ضرور ہوتے تھے اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ہر شاعر غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے۔

جو شاعر غزل اور مرثیہ دونوں کہتے رہے انھیں چھوڑ کے جن شعراء نے غزل ترک کر دی انھوں نے اپنی غزلوں کو سلام بنا لیا۔ غزل کے سنجیدہ شعر سلام میں آ گئے جس طرح امید اور حالی چاہتے تھے مثال میں میر انیس کو دیکھیے ان کی غزل ہے ۔

اشارے کیا نگہ ناز دلربا کے چلے
جب ان کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے

پکارا کہتی تھی حسرت سے لاش عاشق کی
صنم کہاں ہمیں تم خاک میں ملا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

رہی غرور سے نفرت سیاہ کاروں کو
قلم کی طرح چلے جب تو سر جھکا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا !
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

انیس، دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیس نے اس غزل کو یوں سلام بنایا ۔

لحد کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہاں سے جو اصغر تو مسکرا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

خرام اسپ شہ دیں دیکھتے ہم تشبیہ
کہاں ہے کبک دری چال لاکھ بنا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

حسین کہتے تھے روتے تھا علی اکبر
بہار باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے

فلک پکارے کہ الٹا زمین کا طبقہ
حسین فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے

اس میں تین عشقیہ شعر حذف کر کے بقیہ تین شعر بڑھائے ہیں ۔

اس غزل کو سلام بنانے کے لئے انیس بقیہ اشعار زیادہ لکھے ہیں لیکن

بعض میں ایک آدھ شعر صوفیانہ ہے جیسے ؎

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا
ہر ایک ذرہ کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں
کہ فخر سلطنت آب سمجھے ہیں

بھگو کے کھاتے ہیں جو نان خشک کو وہ
اسی آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں

ابھی تو ابر کے در کا ہے ذرہ مقدور
ہم آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں

یہ اشک تاک ہے کہتے ہیں جس کو اہل طرب
یہ عطر گل ہے جسے ہم گلاب سمجھے ہیں

شباب مجھ کو کبھی غفلت دیتے ہیں
سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں

بچھایا سر کو نہ کیوں حکم عراق کی فضا
سوال شاہ کو سب لا جواب سمجھے ہیں

خدا کی راہ میں ایذا دے جس کو راحت
زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

اس سلام میں حق شعر تو ایسے بھی ہیں جیسے غزلوں میں بھی ہوتے ہیں صرف آٹھواں شعر ایسا ہے جو غزل کا بھی ہے۔

ان کے سلام میں بہت سے شعر ایسے ہیں جن میں غزل کا رنگ پوری طرح موجود ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل کا شعر ہے جیسے ؎

بلبلیں دم بھر جدا ہوتی نہیں
کس گل تر کے گلے کا ہار ہوں

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹتے ہیں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پڑھیں تو وہ نہ کیوں کچھ کہ شعروں کو
خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

نہ جانے برق کی چمک تھی یا شرر کی چمک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

کور ہو تم اس کا جلوہ دیکھ کر
شکر ہے آنکھوں کا پردا رہ گیا

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے
فقیر ہوں نہیں عادت سوال کی مجھے

قناعت نہ گھر آرزو دو دو
ہم اپنے کیسہ خالی میں کیا جنس رکھتے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیس
فقیری میں بھی دل تونگر رہے

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے

قطع امید ایک دن سے کر مجھ کو چشم نہیں
اور کچھ ساماں کرے گا خدا میرے لئے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں وہاں ہم قدم رکھتے نہیں

جو مقدر ہے وہ ملتا ہے تری سرکار سے
ہم ہیں صابر کچھ خیال بیش و کم رکھتے نہیں

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

فقیروں کی کیا موت کیا زندگی
جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

سنت و شو ہے گو ہوا اجلا ازل
جامۂ اصلی میں دھبا رہ گیا

اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا
اسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا

ہر نفس آئینہ دل سے یہ آتی ہے صدا
خاک ہو جاؤ تو حاصل ہو جلا سینے کے

بھیجے جنت میں یا دوزخ الحکم للہ
تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لئے

فقیر دوست جو ہے مجھ کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

انیس مخمل و دنیا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

خاک ساری نے دکھائیں رفعتوں پہ رفعتیں
اس میں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

قصیدہ

دورِ اول کے شعراء یعنی ناسخ و آتش نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔

دورِ دوم میں ناسخ کے شاگرد فقیر محمد خاں گویا نے پانچ چھ قصیدے کہے ہیں مگر انھیں قصیدہ کہنا مشکل ہے۔

آتش کے شاگردوں میں نواب سید محمد خاں رند نے ایک بلند پایہ قصیدہ لکھا ہے جس کی تشبیب یہ ہے :-

حسن بے ہوگی یہ کچھ عارضِ گل سے منمود	رنگِ خارِ بستاں سبزۂ نو خیز سے معمور
فیض سے بادِ بہاری کے کریگا اسال	آہ بلبل کے شجر سے گل تا تیر ظہور
قوتِ نامیہ کے نشو و نما کے باعث	دانۂ اشک بھی سر سبز اگر ہو گیا دور
پشت طاؤس بنا سے ہوا بسکہ مو	دامنِ بادِ صبا سبزہ رنگین سے معمور
جو یہی جوشِ نظارت کا زمانے میں رہا	کیا عجب زخم کا بھی سبز اگر ہو انگور
لعل سے رنگ زمرد کا گیا ہے پیدا	سبز زنگار کے مانند ہوا ہے کافور

دورِ سوم میں منشی اسمٰعیل حسین منیر نے ایسے قصیدے بہت کہے ہیں۔

جن کا مثل نہیں خاص طور پر ایک قصیدہ تو ایسا ہے جیسا سودا، ذوق، غالب اور مومن بھی نہ کہہ سکے اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ مولوی فضل حق خیرآبادی اور منیر دونوں کو عبور دریائے شور کا حکم ہوا وہاں دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔

ایک دن مولانا نے منیر سے کہا کہ مصطلحات عجم اور کتابیا فرس کیوں نظم نہیں کیے جاتے یا تو اردو اس کی متحمل نہیں یا تم میں کوئی اس پر قادر نہیں سودا نے قصیدے کہے مگر وہ بھی اس راستہ پر نہ چل سکے۔

منیر نے پہلے تو کچھ دشوار بتایا لیکن مگر مولانا کی ہدایت پر اٹھے بیٹھے اس کے بعد اس فکر میں ایک دن رہ کر امام حسن علیہ السلام کی مدح میں کہا جس کی تشبیب ...

قصیدہ امام حسنؑ کی مدح میں

اتنک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن	غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن
آب مدور زیر تازہ حنا بند گئی	ابرو زال زری نسل کمیت تمہن
میاہ سیہ میں گرا یوسف زریں قبا	دلو سیہ ہو گیا شاہد پروین پرن
بال بشہ نیمروز بسکہ ہوا کم بہا	زنگیوں کے بالوں سے بدلی ہنری کرن
خیمہ زرباف میں لیلیٰ مشکیں لباس	زینت فانوس میں شمع مرصع لگن
پنجۂ کفِ الخضیب شانۂ گیسوئے شب	سرمۂ چشم نجوم مشک غزال ختن
خندہ دنداں نما زنگی شب نے کیا	تخت سلیماں ہوا تکیہ گہ اہرمن
گنبد فیروزہ میں چھوڑ کے تابوت کے	دخترکاں نعش نے بھر نے لگیں خنجرِ زن
لالہ داغ پلنگ تھی شفق آسماں	دیکھا وہ رقیب کیکے ہوا سینہ
خسرو اقلیم چین قصر ششم میں مکین	ہندو بالانشیں صرف بت در یمن
ترک کماندار نے تیر کیا زیب قوس	زینت دست سماک نیزہ خاور شکن
دیدۂ زمرد نگار منظر اختر نما	کرنے لگا آشکار صورت جلوہ فن
صوفی ازرق لباس اپنی لنگی میں تھے	اوڑھے الماس پوش شاہد بابل ظلمت
نظم نکالی ہوئی خمسہ حسرت زدہ	فکر بلالی بنے اختر بدر کا سخن
تیر شہاب و شعاع خوب چلے دیر تک	ناوک ارجن ہوا مرکز کا خنجر کرن
خوشہ کے پیر دانہ نے پائی یہ نشو و نما	برطرح کے ہوئے تخل طور مثل خیار ہن
تا جگر تیر سرخ ناوک دندان فیل	سر چند بیاض آگئی تا کجلی رن
آئینہ خاوری چشمہ بے آب تھا	حلقہ سیمیں ہوا شمع سر انجمن
جلوہ گر بام سبز طائر سیماب گوں	زاغ سیہ کا شکار مرغ طلوع بدن
خضر زمرد لباس صاحب ست اقلیم	زیب مصلائے سبز بوالی بابل وطن

دور سوم میں امیر مینائی نے دو قصیدے کہے انھیں نظم کہنا زیادہ صحیح ہے ہاں مولانا
علی حیدر نظم طباطبائی اور مرزا رسوا نے بہت زوردار قصائد کہے مرزا رسوا کا کوئی
قصیدہ ہمارے پاس نہیں نظم طباطبائی کے ایک قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو۔ ؎

کیا اشارے کر رہی ہے دیدۂ چشم روزگار — کیا شرارے بھر رہا ہے ابلق لیل و نہار
پردۂ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر — ناز گردوں کی کھنچی لیلئ شب تیرہ بہار
ہے شفق یا دامن فیروزہ گوں میں لالہ زار — ہے سحر یا سبزہ زار آسماں میں انتشار
چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا نکلا ہے تار صبح کا — یا بنا گوش زلیخا میں ہے دُرِّ شاہوار
آفتاب آیا نظر زیر گریبان افق — ہو گئی غائب شب یلدا ہوا صبح آشکار
آتش افروزی جو کی مشرق میں صبح سرخ نے — ہو گیا مغرب میں پنہاں ساقی دار
شعبدہ گر نے یہ کی افسوں گری — چہرہ مشرق میں اگل کر
یہ سحر ہے یا کہ ہے رنگ رخ عذرائے چرخ — یہ شفق ہے یا کہ ہے خون رگ ابر بہار
ہو گیا فیض سحر سے چہرۂ گردوں جگر — بن گئی لطف ہوا سے کہکشاں بھی نو کا ہار
حور کا دست نگاریں ہے کہ ہے کف — آرسی ہے یا نظر آیا ہے یہ رنگ عذار
خوشۂ گندم ہے یہ صندل کف عذرا میں ہے — گوندھنے کی ہاتھ میں لی ہے زلف
عدل کا جلوہ دکھاتی ہے یہ صبح جانفزا — جس کے گھونگھٹ سے سفیدہ صبح کا ہے منتشر
الشمس اس کے زیر پا ہیں شعلے نور کی — نکلی ہے چادر آب زر کی یہ عذار
چشمۂ خورشید میں غوطہ لگاتی ہے یہ پھیر — گنبد نیلو فری پہ کوئی دم سے کر قرار
آنکھ ابھی محو تماشا تھی کہ جھجک کر رہ گئی — جلوہ انجم ہو گا یا رقص شرار
صبح ہوتے خیمۂ زنگار نوں آیا نظر — تھا طلسم سیمائی گنبد گوہر نگار
ہو گیا لشکر یہ غالب ایک تحریک نیزہ دار

پہنچا ہے بام گردوں پر کمند اپنی کرن!
کرتا ہے تیر شعاعی طائر شہرہ شکار

اس دور کے شعراء میں آرزو صاحب کا قصیدہ نہیں ملا۔ ایک صاحب
نے عزیز و محشر کے قصائد کا مجموعہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر کئی
تقاضوں کے بعد بھی ان کا وعدہ پورا نہ ہوا بقول مولانا صفی ؎

وعدے میں حاتم ہیں جب دینا پڑے قارون ہیں

ایک صاحب کا میں شکر گذار ہوں کہ انھوں نے زحمت اٹھا کے
اور پیسہ خرچ کر کے عزیز و محشر کے ایک ایک قصیدہ کی فوٹو اسٹیٹ
کاپی عنایت فرمائی یہ انتخاب ان کا ہے اگر مجھے وہ دیوان دیتے
تو میں عزیز کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس کے مطلع کا دوسرا مصرع یہ ہے ؎

لہو کچھ بڑھ گیا جب فصد دیوانوں نے کھلوائی

اور محشر صاحب کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس میں جنگ خیبر نظم ہے
اور جماعت استقلالی میں مطلع یہ ہے ؎

رہا بیدار کس کی گرمی محفل سے یہ شب بھر — نے چشم رمد آلود نکلا خسرو خاور

یہ ان کا شاہکار ہے اور اردو میں اس کا جواب نہیں مجبوراً اپنے
کرم فرما کا انتخاب پیش کرتا ہوں۔

دور آخر کے شعراء میں مرزا جعفر علی خاں اثر نے بھی بڑے زوردار
قصیدے کہے ہیں مگر مجھے دستیاب نہیں ہوئے۔ انشاء اللہ آئندہ
اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔

* * *

مولانا صفی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ میرے پاس ہے
جو پیش کرتا ہوں۔

طرزِ عمل بدل لئے نقش نئے نئے مجھے
رنگ کچھ اور ہو گیا صفحۂ روزگار کا

ذرّوں کو جلوۂ مہر کا شہرتِ عام نے دیا
تنگ نظر مگر وسیع دائرہ اشتہار کا

دیکھ چکے ہیں جو صفی معجزۂ پیمبری
آنکھ نگہ میں کیا جچے شعبدہ ذو الخمار کا

کور سوادِ امتیاز ایسے بھی ہیں جہاں میں
کرتے ہیں جو مقابلہ جلوۂ نور و نار کا

دوست کسے بنائیے محرمِ راز کون ہے
کس کو سماں دکھائیے سینۂ داغدار کا

آئی خزاں بہار میں رنگ سے ست چھن گیا
سر سبد چمن تھا جو گل مری شاخسار کا

اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ کھنچ گیا سخن ہی
سہل نہیں سنوارنا طرۂ تابدار کا

خاک میں گو ملا دیا جوشِ سکوت نے مجھے
پھر بھی چراغِ راہ ہے نقش مرے مزار کا

خمکدۂ غدیر کا بادہ کش قدیم ہوں
دوش بدوش طور ہے پایہ مرے وقار کا

خانۂ گلفشاں نہیں تیشۂ کوہکن ہے یہ
پست و بلند شعر ہے سلسلۂ کوہسار کا

حوصلہ ہے تخیلوں کی بھی عرش تو چھو چلے صفی
ہو گا بلند اور ابھی کیا علمِ افتخار کا

چھیڑ کے داستانِ فخر طول بہت دیجئے
سازِ سخن کی جان ہے زمزمہ اختصار کا

دستِ دعا اٹھا ہے چشمِ کرم ہے منتظر
نقشِ اثر بٹھائیے سکۂ اعتبار کا

جب تک الٰہی ابر میں جلوہ فروش ہے برق
ابر ہے میر کارواں قافلۂ بہار کا

مخلص سبز کار کا مزرعِ دل ہرا بھرا
خرمن آرزو تباہ خصمِ سیاہ کار کا

محشر لکھنوی

در مدح امیر المومنین علی ع

نہ پوچھ اے ہمنفس ہنس ہنس کے اس کی لذتِ شادی
بنا رکھا ہو جس کو دل کی بیتابی نے فریادی

مآلِ کارِ غم سنتے ہیں ہم اچھا ہی ہوتا ہے
مگر تا چند آخر مجمعِ حسرت کی بربادی

خدا جانے کہ ہو کب شاد مقصد کا نظارہ
خدا معلوم کب ہم کو ہو قیدِ غم سے آزادی

دکھاتا تو ہم ہیں [illegible] دل [illegible]
ابھی یہ آسمانِ پیر سے [illegible] زورِ جلادی

قدم جب وقت [illegible] سمت [illegible]
دکھا دی ہے قسمت [illegible] بجز فولادی

کہا [illegible] شہیدِ [illegible]
کہاں تک [illegible] غم پہ سرکوبی و فریادی

قدم گھر سے نکلنا چاہیئے [illegible] منزل
سوادِ شہر بھر ہو گا [illegible] آبادی

صدا آئے الرحیل اپنے [illegible]
ہمارے کان گویا تک [illegible] شادی

خروش دلربا [illegible]
[illegible] آزادی

ملال انگیز ہے صبحِ وطن اہلِ محبت کو
مزہ کچھ غیر آ جاتا جو آئے شام بربادی

نقاب اٹھائے جبکہ مہرِ آسماں [illegible]
گھڑی [illegible] قتلِ [illegible]

چلوں خونابۂ قلب و جگر سے [illegible]
گروں [illegible] شوق [illegible] منزل [illegible] کی وادی

شکستہ [illegible] ٹھوکر سے ہو سنگِ رہِ ناکامی
ہٹا دوں ہو اگر سدِ سکندر کو بھی بربادی

کروں اپنی سی کوشش پھر تو جذبِ دل ہے اور منزل
وہ منزل قیدِ غم سے جس جگہ ہوتی ہے آزادی

وہ منزل نقشِ اول جو نگارستانِ عالم ہے
سراسر جس میں ہے نقشِ صنعتِ قدرت کی استادی

وہ منزل خلد کہئے جس کو یا عرشِ بریں کہئے
دلِ غمگیں کی خاطر وقف جس میں جلوۂ شادی

وہ منزل جس جگہ دامانِ امید آ کے بھر جائے
مرادیں دل کی خاطرخواہ پائے لیکے فریادی

وہ منزل مرکزِ امن و اماں جو دورِ عالم میں
جہاں تیرِ ستم کو دورِ آسماں کا زورِ جلادی

وہ منزل جو زمیں سے آسماں تک نور سر تا سر
جہاں انساں کے بدلے فرشتوں کی ہے آبادی

وہ منزل مدتوں سے آج تک جس کے تصور میں ۔ بتاں کعبہ پتھر بن گئے یوں لوٹ کر گیا دی

تعالی اللہ وہ منزل جس کو ارض نجف کہیے ۔ اسیران گنہ کو جس جگہ حاصل ہو آزادی

وہ منزل آستانہ جس کو باب علم کا کہیے ۔ کہ جس کا گرد ان جبرئیل پہ ہے حق استادی

وہ باب علم یعنے شوہر بنت رسول اللہ ۔ کیا تجویز جس کو خود خدا نے بہر دامادی

وہ داماد قوی بازو نصیر احمد مرسل ۔ رہی کی زد میں ملائک نے جس کی تیغ فولادی

وہ فولادی حسام برق زا جس کی ضیا بار ۔ پئے اہل ضلالت بن گئی تھی رہبر ہادی

وہ ہادی کفر کے ظلمات سے جس نے ہزاروں کو ۔ نکالا اور عطا کی مجلس دوزخ سے آزادی

وہ آزادی کہ جس سے اب ہیں انکو جنت میں ۔ تصدق انکی ہر اک آرزو پہ عشرت و شادی

بنایا کل جن و انس و ملک کا ایکو ہادی ۔ رہے قد خوشنما صنعت گر عالم کی استاد

وجود ذات حضرت سے ہوا آباد سر تا سر ۔ طلسمات جہاں تھا ورنہ اک تصویر بربادی

اٹھائے آپ کے الطاف اگر رستم کی اولاد ۔ نمونہ لعب حسینان جہاں سے کار صیادی

شجاعت آپکی جب یاد آتی ہے غلاموں کو ۔ تو پھرتی ہے نگہ میں خیبر و خندق کی بربادی

دم اظہار قوت بھی مراعات کرم رکھی ۔ دل دشمن نہ توڑا توڑ ڈالا باب فولادی

دکھائیں آپ گر کچھ شان نور امامت کا ۔ تو اکھڑے قلعہ ارض و سما کی خشت بنیادی

مرا ذمہ جو کوئی روک لے پھر باب جنت پہ ۔ در مشکلکشا پہ جو اگر شد از فریادی

یہ پہلی آپکے قدموں کی برکت تھی زمانے میں ۔ کہ اجڑا گھر بتوں کا اور ہوئی کعبہ کی آبادی

نجف کی خاک میں مل جائیں تو حاصل ہو دل جمعی ۔ بگولوں کو اسی دشت میں ہے شوق بربادی

جا دین شحنہ عدل شہ والا کا ایسا ہو ۔ نہ لے مریخ پھر صبح ابد تک نام جلادی

ید اللہی دکھائی آپنے یوں جنگ خیبر میں ۔ کہ توڑا کفر کے رشتے کی صورت باب فولادی

ہوا جب یہ عقد شور اٹھا ملائک میں ۔ مبارکباد یا حیدر رسول اللہ کی دامادی

نکالیں دست ظالم سے جو مولا دل شکستہ کو ۔ ہلا دے گنبد دور فلک کو نعرہ شادی

محیط الفت مشکلکشا میں غرق ہوتی ہے ۔ ملی یونس کو بطن حوت کے زنداں سے آزادی

پکاری شان اسلام انکی پیدائش پہ کعبے میں ۔ اسی بچے کے ہاتھوں سے بتوں کی خانہ بربادی

عدالت اس کو کہتے ہیں یہ ہے لطف ید اللہی ۔ کہ کاٹیں دست سارق اور نہو اسی خطے کی بربادی

طریق راستی کر دیں جو تعلیم آپ ارشاد سے ۔ فلک سا دشمن عالم بھلا دے اپنی کیا دی

کیا جنت کو آباد آپ نے اسلام پھیلا کر ۔ وگرنہ پہلے دنیا بھر میں تھی تقلید شدادی

شریک کاروان لطف حضرت ہو گیا آکر ۔ جرس وقت سفر بیتاب بن کر جو نہ فریادی

قدم فرسا کہاں تک وادی مدحت میں اے محشر ۔ نہیں زیبا ہے پایہ ادب کو اتنی آزادی

بامید دعا سینے میں زبان کے نار کی صورت ۔ مجھے لے شوق دکھلا دو سخن کا طرز استادی

مبارک ہو کہ اٹھے پردہ ہائے نامرادی بھی ۔ خدا لو لو کشف کا نام لیکر اب ہو فریادی

خداوندا مرے شوق دلی کی پیچ حسرت کر ۔ زیارت سے نجف کی پھر مجھے ہو عید و شادی

ہوا میں اڑ کے وہاں کی خاک پھر جل بصر بخشا ۔ زمیں پہ پھر دکھائی دے مجھے جنت کی آبادی

پڑھوں پھر میں یہ قصیدہ مدح باب علم میں جس سے ۔ صدائیں غیب سے آئیں کہ ہے یہ شان استادی

نظم

میر دوست علی خلیلؔ

کوئی ساٹھ برس سے ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے نظم اُردو ادب میں داخل ہوئی ہے اس کی کوئی خاص ہیئت نہیں ہے نہ کوئی مخصوص موضوع ہے۔ مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس سب میں کہی جاتی ہے اور موضوع کے لحاظ سے ہر طرح کے خیالات و مناظر پیش کیے جاتے ہیں مگر حقیقت میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اُردو شاعری کے ساتھ اس کا وجود پایا جاتا ہے، قطب قلی شاہ کے دیوان میں بھی اس طرح کی نظمیں موجود ہیں اور ولی کے یہاں بھی، شمالی ہند میں میر و سودا، نظیر اکبرآبادی سب نے نظمیں کہی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسے ایک مستقل صنف نہیں سمجھتے تھے ہیئت کا لحاظ کرتے تھے مثلاً اگر مثنوی کی طرح کے اشعار میں برسات کی کیفیت نظم کی ہے تو وہ اسے مثنوی کہتے تھے اور اس کا عنوان قائم کرتے تھے "مثنوی در موسم برشگال" اگر مسدس میں ہے تو مسدس در موسم برشگال۔ اب مثنوی یا مسدس کو حذف کر کے صرف موضوع لکھ دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ بہار، برسات، پہاڑ اور گرمی وغیرہ چاہے وہ ہیئت کے لحاظ سے کسی صنف میں ہوں اتنے سے تغیر سے ایک نئی صنف بن گئی۔

لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے زمانے سے (جب سے لکھنؤ شاعری کا دور شروع ہوا) ایسی ایسی نظمیں کہی گئیں جن کا مثل اُردو میں نہیں ہے۔

دورِ اول کے شعرا میں میر دوست علی خلیل کی ایک غیر مطبوعہ نظم ایک ہم قلمی بیاض سے پیش کرتے ہیں، جس کا موضوع افیم ہے اس کا عنوان خلیل نے طلسم ہوشربا رکھا ہے اس لیے ہم نے بھی یہی سرخی رکھی ہے۔ پیش کریں گے۔

طلسم ہوشربا

مردمِ چشمِ حسینانِ جہان ہے افیون   غیرتِ خالِ رخِ حورِ جناں ہے افیون
طفل بھی مرتے ہیں جس پر وہ جواں ہے افیون   طرفہ معجون عجب روحِ رواں ہے افیون

اس قدر عاشق و شیدا ہیں جہاں میں اسکے
یہ وہ لیلیٰ ہے کہ مجنوں ہیں زن و مرد اسکے

اس پری زاد کے اوصاف کہوں کیا میں بیاں   حاکمِ مملکتِ ہند و حبش کی سلطاں
مستی کوہ سر دار آتش موسیٰ کا دھواں   مرہمِ زخمِ دلِ عاشقِ بیتاب و تواں

بیشتر بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے
لوگ معشوقِ سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے

کوئی ساون کی گھٹا کہتا ہے کوئی ظلمات   کوئی لیلیٰ اسے کہتا ہے کوئی وصل کی رات
اس کی تلخی میں بجز اپنے مزۂ قند و نبات   اسی معجون کی تاثیر میں ہے موت و حیات

دل میں ہے کافر و دیندار کے الفت اسکی
سنگِ اسود سے سوا کرتے ہیں عزت اسکی

لیلۃ القدر اسے کہتا ہے کوئی انساں   کوئی کہتا ہے اسے سجدۂ عابد کا نشاں
مشک کہتا ہے کوئی، کوئی دوائے خفقاں   کوئی گلدستۂ سوسن کوئی مجلس حرزِ جاں

ہے عجب ہوش ربا خلق میں نیرنگ اس کا
سنگِ موسیٰ ہے بدن لال ہے پر رنگ اس کا

یہ وہ ہے قوتِ دل راحتِ جاں نورِ نظر   دیدۂ عاشقِ بیتاب میں ہے اس کا گھر
نہیں چھپتا نہیں چھپتا ہے کبھی اس کا اثر   دیکھ لو دیکھ لو پردہ جو نہ ہو آنکھوں پر

آنکھوں میں اس کی عجب جلوہ گری رہتی ہے
انھیں دو شیشوں میں یہ ایک پری رہتی ہے

ہے تجلی اس کی رسائی کمند فکار — واں پہنچتی ہے جہاں وہم کا بھی ہو نہ گزر
برق کی طرح نہیں ایک جگہ اس کو قرار — خلوت خاص کی پابند نہیں یہ خیار

کون سا عضو ہے جس میں نہیں گھر کرتی ہے
روح کی طرح سے رگ رگ میں گزر کرتی ہے

ہاتھ لگ جانے سے ہوتے ہیں جو شاد اس کے مرید — جانتے ہیں اسے شاید وہ ضیائے شب عید
یا سمجھتے ہیں اسے قفل در دل کی کلید — آنکھیں کھل جاتی ہیں تم دیتے ہی اس شوخ کی نیمہ

جان کر آب حیات اس کو بشر پیتے ہیں
جو نہیں مرتے ہیں اس پر وہ عبث جیتے ہیں

اس کی گولی صبر لستاں سے حسیناں کبھو — اس کے غمزے سے تجلی دلبر کم سن کی ادا
ہوش اڑاتی ہے ارسطو کے جو ہو صاحب ذکا — ... پڑھا نہیں گیا . . . .

ایک دم قید سے اس کی جو نہیں چھوٹتے ہیں
بے خودی کے وہی دنیا میں مزے لوٹتے ہیں

کیا پری زاد ہے کیا حور ہے یہ ہوش ربا — دل زاہد میں ہے ایماں کی طرح اس کی جا
کچھ اکیلے نہیں دیندار ہی ہیں اس پہ فدا — اس شب قدر کے کافر بھی ہیں مشتاق لقا

یہ حسیں وہ ہے کہ ہے غافل و ہشیار کی جاں
اس پہ جاتی ہے ہر اک کافر و دیندار کی جاں

اس چھلاوے کے نرالے ہیں جہاں میں انداز — کہیں جادو ہے کہیں سحر کہیں شعبدہ باز
اسی سلطان کے ہیں حسن کے محمود و ایاز — بے خبر رہتے ہیں اس شوخ کے سب محرم راز

نہیں کھلتا ہے کہ بند آنکھوں سے کیا دیکھتے ہیں
دیدۂ دل سے مگر شان خدا دیکھتے ہیں

جام دل اس کی محبت سے اگر ہو مخمور — دائم الخمر رہے بادۂ گلگوں سے نفور

پاک طینت ہے یہ دنیا میں نہ آیا ہے کبھی دور — اس کے مشتاق سے ہوتا ہی نہیں فسق و فجور

اس سے کم رتبے نہیں کچھ بھی کسی مذہب میں
صورت آب رواں پاک ہے ہر مشرب میں

سانولے رنگ کا جلوہ ہے عجب ہوش ربا — دم پھڑکتا ہے شب و روز سیہ چشموں کا
سحر ہے نافۂ ادا قہر بلا ہے غمزہ — بد مزاجی بھی ہے اس شوخ کی خوبی کا مزا

مشتہر ہے خوب تر گنبد افلاک اس کا!
دل سے پیتا ہے کرمیوں کو بھی امساک اس کا

اس کی صورت پہ جو آتا ہے ہر اک تخت نشیں — تیرگی اس کی ہے شاید کہ سواد سطر یار
تجلی اس سے ہے جبیں میں خط سوسن کی بہار — دو رماں اس کا ہے شام شب گیسوئے نگار

دل میں جا دیتے ہیں عشاق جگر ریش اسے
کانکا جانتے ہیں کافر بد کیش اسے

یہ وہ محبوب ہے اس کا ہو اگر تجھ کو وصال — آدمی زاد میں پیدا ہوں فرشتے کے خصال
نہ ہوس کھانے کی رہتی ہے نہ پانی کا خیال — اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں جو پائے وصال

اس سے صحبت جو تہ گنبد افلاک رہے
جرم عصیاں سے فرشتوں کی طرح پاک رہے

فلسفہ عشق و محبت سے ہے اس کی تاثیر — نوشدارو ہے کسی کو تو کسی کو شمشیر
ہے کہیں ابر غضب اور کہیں ابر مطیر — سپر تیغ الم تو سن اجل کا ہیں تیر

نہیں کھلتے ہیں کسی شخص پہ نیرنگ اس کے
گردش چرخ سے ملتے ہیں بہت ڈھنگ اس کے

یہ وہ ہے پیر طریقت کہ جو ہو اس کا مرید — ماسوی اللہ سے اک دم میں وہ ہو جائے بعید
بس کہ رہتی ہے اسے نفس کشی کی تاکید — کیا عجب ہے جو خدا زیست میں دے اجر سعید

میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا | پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں | لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا
تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست | اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو مہ وش | کوئی وہاں مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ | یہ ریش جس پہ جلوہ ہے وسمہ خضاب کا
کھینچے ہنسی ہنسی میں وہ منہ کو ملا کے منہ | دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا
منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو پیئے | گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو | گر مجھ کو بھی خوف کچھ روز حساب کا
اور امتحان بغیر ہے توبہ آپ کا غلام | قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

دور دوم کے شعراء میں مولوی علی میاں کامل نے کئی نظمیں کہیں جن میں مرزا دوست کی بہت مقبول ہوئیں۔

مزار دوست

شب کو جا نکلا تھا میں کامل مزار دوست پر | اسی جہت سے مثل ابر آنکھیں مری خونبار ہیں
قبر پر الحمد پڑھ کے دوست سے میں نے کہا | ہم گریباں چاک ماتم میں تیرے اے یار ہیں
ڈھونڈھتی ہیں تجھ کو آنکھیں جا بجا شام و سحر | شاہد اس دعوے کے رخ پر آنسوؤں کے تار ہیں
شاد ہے کچھ تو بھی زیر خاک اے نازک بدن | شمع روشن ہے گلوں کے قبر پہ انبار ہیں
کیا ہوا مرنے کے بعد اے راہیٔ ملک عدم | لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں
منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے | راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر ہیں بازار ہیں
جس محل میں جا کے تو اترا ہے اے رنگیں ادا | کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں
چھت ہے منقش یا کہ سادی فرش رنگیں یا سفید | تخت کیسے ہیں منبت یا مرصع کار ہیں
سبز جلتے ہیں کنول یا سرخ روشن ہیں گلاس | باغ ہے سبزہ ہے کچھ اشجار ہیں اثمار ہیں

پھول ہیں کس رنگ کے ہیں کس انداز کے | مرغ زریں بال ہیں یا عنبریں منقار ہیں
اہل صحبت کون ہیں کیسا ہے گفتگو کا طریق | خوش بیاں خوش طبع یا کج فہم بد گفتار ہیں
لوگ ہمسایہ ہیں کیا کس قسم کے کس وضع کے | کچھ مروت آنکھ میں ہے خلق کے آثار ہیں
دعوتیں بھیجیں فقط یا آپ بھی آئے کبھی | اپنے اپنے شغل میں بستے ہیں یا بیکار ہیں
بات کرنے کی صدا اصلا نہیں آتی کبھی | کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں
ماہ کیسا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم | نہریں جاری ہیں چمن میں باغ میں گلزار ہیں
قافلے چلتے ہیں لٹنے کا تو اندیشہ نہیں | گرد کم اڑتی ہے راہیں صاف ہیں ہموار ہیں
کچھ حسینان حرم پیکر بھی نظر آئے کبھی | ان کے قد کیسے ہیں کیسے گیسوئے خمدار ہیں
شکلیں گوری گوری ہیں یا سانولی ہیں صورتیں | ابروئے خم کعبہ کی محراب یا تلوار ہیں
کھوٹ کی ہیں ادائیں یا بناوٹ کے ہیں ناز | ہیکلیں سینوں پہ یا طوق کمر زنار ہیں
قبر سے آئی ندا اے دوست بس خاموش رہ | ہم اکیلے ہیں نہ یاں احباب نے اغیار ہیں
باغ کیسا پھول کیسے عقل ہے تیری کہاں | کنج تنہائی ہے اور افعی گلے کا ہار ہیں
وہ ہمارا پیکر نازک جو تجھ کو یاد ہو | آج خاک قبر سے اس پر منوں انبار ہیں
دو فرشتے آتے ہیں مدفن میں ہیبت ناک جب | اہ ادب ہاتھوں میں لے کے گرز آتش بار ہیں
شق ہوا اس کا کلیجہ وہ صدائیں قہر کی | جوڑ سے جوڑے سینہ و پہلو میں کہسار ہیں
تنگ ہے ہم کو بٹھایا ہے اٹھا کر قبر میں | رعب سے ان کے ہمارے دست و پا بیکار ہیں
لوٹتے ہیں لاکھ ہم لیکن نہیں کھلتی گرہ | جسم میں عقرب ہے تیر غم جگر کے پار ہیں

اب زیادہ بات کر سکتے نہیں لے تجھ کو حیا
دلیں اگر رہ وہ نہ ہوتا کیا کریں لاچار ہیں

دور سوم کے شعراء میں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے بڑی کامیاب نظمیں کہی ہیں اور وہ بہت مشہور ہیں انگریزی نظم کا ترجمہ کیا

انہوں نے کیا ہے اور خشکیوں میں نظمیں بھی بہت کہی ہیں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں اس لئے ہم اس کو ترک کرتے ہیں۔

دور چہارم کے شعراء میں سب ہی نے نظمیں کہی ہیں پہلے چکبست کی نظم سنئے۔

سیر دیرہ دون

نہیں بہار کا پہلے سے مل ہوا تھا شگون
عجیب خط دلکش ہے سیر دیرہ دون

نگاہ شوق نے کیا کہیے کیا سماں دیکھا
نئی زمیں نیا رنگ آسماں دیکھا

سنا جو کرتے تھے وہ باغ یہ فضا ہے یہی
اگر بہشت میں جنت تو راستہ ہے یہی

ازل میں تھی جو قضا اس کی یادگار ہے یہ
نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ

کیا نہیں ہے اسے غارت بشر کی صنعت نے
یہ سبزہ زار سجایا ہے دست قدرت نے

سپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہری ہریالی

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا
بجائے خاک کے اڑتا رنگ سبزہ کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن پر
پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن پر

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و سحر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آکے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انہیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں
یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا
یہ بل زمیں کی تیوری پہ آگیا کیسا!

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر

نگہ کو دور سے پانی جو ہے نظر آتا!
سفید ناگ چلا آرہا ہے بل کھاتا

قریب بیٹھا ہے آخر یہ دور کا عالم
نگاہ دیکھتی ہے پھر سرور کا عالم

فضائے کوہ میں ایسی ہو سماں ہے
بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے
نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اثر نہیں
یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر
ہوس تھی روح کو مل جائے اسمیں سے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی
نگاہ شوق میں اک شان بے حجابی تھی

نشست سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے
رواں تھا چشمۂ آب خنک نظر کے تلے

شریک حال تھی وضع قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شراب حسن حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ دشت غبار

درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا
ظہور کیا نہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا

یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے اعضا ہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

انھیں سے نغمۂ قدرت ہے روح و ہستی میں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزم ہستی میں

جدا کسی سے سمجھتا تھا اپنی ذات نہیں
کچھ انتشار نہیں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک نہاں اس کا جسم پانی ہے
جو روح ہم میں ہے ان میں وہی روانی ہے

اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار
کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اس پہ نثار

دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ارماں سے
کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

مولانا صفی

دریائے گنگا کے کنارے شیعہ کانفرنس کا اجلاس

صبح بنارس

ہے لبِ دریائے گنگ اک بہار آئی ہوئی — کوثر آثار رُخ کی ہر سو چھاؤنی چھائی ہوئی
ہر طبیعت حسن کے منظر پہ ہے گھبرائی ہوئی — لب پہ اک موجِ تبسم آنکھ شرمائی ہوئی

ڈوب کر کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے گنگا جبرِ شئی وش کا جو سماں تعبیر ہے — خط قوسی میں سر جدول تھا تحریر ہے
پل ہلالِ عید گنگا صاف جوئے شیر ہے — یا بتوں کے ابروئے پیوستہ کی تصویر ہے

آسماں تھا فتنہ باری میں جو مشہور جہاں
سر زمین حسن نے کھینچی ہے غمزہ کی کماں

ہے حصارِ عافیت کی پشتیاں اس پل کی نیو — سینۂ بتاں نے پایا ہے مرتبہ بے راحت کوئی دیو
پیکرِ کاشی پہ ہے کیا خوشنما اک جنیو — ہے کہیں سر پر لبِ گنگا کہیں

سنگ ہی سا ندر انڈین گھاٹ پر کی چوکیاں
آفتِ جاں دشمنِ جاں دین میں سب الا

ہے ہلال خط میں آبادی بنارس کی تمام — گھاٹ مندر سب لبِ دریا کس انتظام
ناؤ پہ چڑھ کر انہیں دیکھو جو نامی ہیں مقام — ماہ رولوں کا ملے گا ہر جگہ پہ اژدہام

صدقے اپنی گل زمیں پہ ہو گلستاں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار

چشمِ بد دور رات بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے — ہر ادا بیہوش حسینوں کی یہاں کی قہر ہے
غیرتِ کشمیر ہے یہ انتخابِ دہر ہے — ہر گلی کوچے میں جاری حسن کی اک نہر ہے

صاف ہیں شفاف ہیں کتنے یہاں کے بتکدے
رہتے ہیں ہر دم دلہن کی طرح پھولوں سے لدے

وہ دھندلکا صبح کا وہ دور رنگ گنگا کا پاٹ — وہ کھنگالے رو نمایاں جابجا پانی کی کاٹ
وہ پریزادوں کے جھمگھٹ سے رشکِ راج گھاٹ — دل بہل جائے جواں کی طبیعت ہو اچاٹ

اتریں پانی میں جو ہر دم صبح کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھ لو آبِ رواں میں حسن دلکش کی بہار — صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلفِ تابدار — بال کا باندھا چلا آتا ہے جسمیں خود شکار

جھوم کے اٹھی جہاں گنگھور متوالی گھٹا !
دیکھنا برسائے گی موتی سی یہ کالی گھٹا

جس کا شیوہ ہے اسی پردہ میں کھنڈی گرمیاں — کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
صوفشاں سورج ہے لیکن ہٹ گیا بولی جہاں — خود کہے گی طاقتِ نظارہ ہو کیا امتحاں

جامہ زیبی سے دو بالا شان مجبولی ہوئی
سارا پا قوسِ قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

زعفرانی ہر کسی ماتھے پہ ٹیکا صندلی — دل سی نازک تر لئے ہاتھوں میں اک گنگا جلی
لب ہلوں موجِ تبسم جیسے کھلتی ہو کلی — دل جہاں پھسلا وہ توبہ سے نکلا یا علی

جب لڑیں باہم نگاہیں کافر و دیندار کی
کان میں آئی صدا یا قوس استغفار کی

ہے غدیرِ خم کے متوالوں کا گنگا پر جماؤ — محتسب کا زور چل سکتا نہ قاضی کا دباؤ
دھن یہی کوثر سے کاٹو نہر گنگا میں گراؤ — حشر تک اے نہ ہوش اتنی سوا اتنی پلاؤ

جھو ہے نکلو بنارس میں جدھر بھی سیر کو
چھیڑ کر کلمہ پڑھاؤ ان بتاں دل کو

لکھنؤ کی ایک برسات

گھر کی رہنے والیوں کو زندگانی تھی عذاب — گھر سے جب نکلیں ردائیں اوڑھ کر مثلِ حباب

سر پہ بارش گود میں بچے کمر تک جوئے آب — پاؤں بالائے زمیں وردِ زباں یا بوتراب

کس قدر پانی کہاں ہے کچھ پتا چلتا نہیں

قسمتوں کا پھیر دیکھو راستہ ملتا نہیں

مولانا صفی نے ایک قومی ترانہ بھی کہا ہے جو بڑا زوردار ہے اس کے بعض اشعار دوسروں کے نام سے مشہور ہیں اس لئے ہم اس نظم کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اسلامی ترانہ

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے — مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے

دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں — بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے

ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ — شعلے بھڑک اٹھیں گے جو ہم کو دبا دیں گے

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن — وقت آنے دو وقت آنے پھر تم کو بتا دیں گے

دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی — دیکھو جو ہمیں روکا طوفان اٹھا دیں گے

ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو مٹا دیکھیں — کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے — اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں — یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے

آئے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہوگا — یہ نظم صفی پڑھ کر ہم اس کو سنا دیں گے

برسات کی شام!

شوق قدوائی

دن ہے کم دیکھو ہٹا مغرب سے وہ ابرِ سیاہ! — کھل گئی دنیا میں آنے کیلئے کرنوں کی راہ

بن گیا خورشید ہلکے رنگ کے سونے کا طشت — دھوپ سے کچھ کچھ سنہرے ہو گئے اشجارِ دشت

وہ شفق کی سرخ رنگت اور فلک کا مرغزار — سادگی بھولی ہوئی گویا دکھاتی ہے بہار

کوہ کے دامن میں یا لالے کا تختہ ہے عیاں — یا جسے کہتے ہیں چرخ اک کوہ ہے آتش فشاں

جلوہ گر ہے چرخ پر سورج کے پرتو سے دھنک — یا اڑا ہے وہ کھلی محرابِ ایوانِ فلک

یا کسی کے واسطے کھولے ہے آغوش آسماں — یا لئے ہے دوش پر ترکِ فلک اپنی کماں

دستکاری اپنی کی معمارِ قدرت نے عیاں — سات رنگوں سے رنگا لا ہے طاقِ قصرِ آسماں

فوارہ

عزیز لکھنوی

ہے فوارے عجب دلچسپ ہے تیرا سماں — یہ تری طبعِ رواں اور یہ ترا جوشِ نہاں

رات دن نیچے میں وہ موتی پہ موتی ڈھالنا — مہر شانِ باغِ رضواں پر وہ ڈورے ڈالنا

گوہر افشانی تری اور ہلکی ہلکی وہ پھوار — وہ شبابِ بلبل و گل اور وہ تیرا نکھار

وہ اکڑ کر دیکھنا اپنی جوانی کی بہار — وہ ترا انگڑائیاں لینا چمن میں بار بار

مضطرب موجِ ہوا ہے تو بہت بیتاب ہے — تیری دھاریں جھومتی ہیں یا کہ نخلِ آب ہے

تو چمن کی روح ہے اور ہے فضا میں تیرا دور — اک بہارِ شادمانی ہے ہوا میں تیرا دور

نذر آتے ہیں تجھے دامن میں پھیلائے ہوئے — عاشقِ شوریدہ سر بیٹھے ہیں کھوئے ہوئے

تیرے دستِ گوہر افشاں کی یہ حالت دیکھ کر — جھولیاں گلشن نے پھیلا دیں سخاوت دیکھ کر

گوندھنا موجِ ہوا پہ موتیوں کے ہار کا — تیرے سر سہرا رہا ہے رونقِ گلزار کا

تیز ہو ہاں میرے فوارے ذرا پھر تیز ہو
پھر جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز ہو

آتشِ گل کا جہاں کچھ بھی اشارا ہو گیا
اُڑ گیا موجِ ہوا پر یوں کہ پارا ہو گیا

تیرا جو قطرہ گیا گردوں پہ تارا ہو گیا
جب گرا آ کر زمیں پر دل ہمارا ہو گیا

سب غبارِ خاطرِ ناشاد تجھ سے دھل گیا
تیرا منظر اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا

مرزا جعفر علی خاں اثر کی ایک نظم کشمیر پر ہے جس کا یہ ایک شعر مجھے یاد ہے۔ پوری نظم مل نہ سکی اس لئے ایک ہی شعر پر اکتفا کیجیے ؎

اُڑتا ہوا غول تتلیوں کا
یا قوسِ قزح سے رنگ برسا

آخر میں جوش صاحب کی نظم برکھا رُت ملاحظہ کیجیے۔ دنیا کی کسی زبان میں اس کا جواب نہیں جن ملکوں میں بارش نہیں ہوتی ان سے تو اس کی توقع ہی بیکار ہے ہاں برصغیر برسات کی جولانگاہ خاص طور پر یوپی بہار بحرِ عرب اور خلیج بنگال دونوں اُمڈ اُمڈ کے برستے ہیں اور ساری زمین ہری ہو جاتی ہے وہیں برسات پر نظموں کی اُمید کی جا سکتی ہے اور وہی سرزمین علم و فضل اور شعر و سخن کی سرزمین ہے مگر تعجب ہے کہ ہندی اور سنسکرت میں بھی ایسی کوئی نظم نہیں معلوم ہوتی جس کو جوش صاحب کی نظم کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا۔

فارسی کے شعرا جو ہندوستان آئے انھوں نے برسات پر نظمیں کہی ہیں مگر جوش کا سا خروش کہاں اُردو میں آزاد و حالی کی برکھا رت نے تو شاعری کا منھ چڑھایا ہے بعض بے عقل اور شعر ناشناس جوش صاحب کو الفاظ کا بازی گر کہتے ہیں جی تو یہی چاہتا ہے کہ پہلے اس پر بحث کی جائے کہ الفاظ بازی گر کے کیا معنی ہیں اور جوش کی شاعری پر یہ قول منطبق ہوتا ہے یا نہیں بہر حال اب جوش صاحب کی نظم سنئے افسوس کہ اس نظم پر جوش صاحب نے نظرِ ثانی کر کے کچھ کا کچھ کر دیا میں نے کئی دفعہ وہ نظم مانگی مگر وہ تو شاہی مزاج رکھتے ہیں۔ مختصر یہ وہ نظرِ ثانی شدہ نظم نہ بھیج سکے اس لئے وہ نظم پیش کرتا ہوں۔

آہا آہا برکھا آئی

بدلی آئی بدلی آئی !!
بدلی آئی بدلی چھائی

بدلی چھائی اور لہرائی
جھر جھر برسی گھڑ گھڑ گائی

آہا آہا برکھا آئی

میلے ریلے تال کنارے
بوڑھے بچے لت پت سارے

دھوم دھڑکا نَدیا نالے
چڑھتے دریا بڑھتے دھارے

گرتی بوندیں چھٹتی کائی

بادل کالے نیلے دھانی
ساری دھرتی ہے جل دانی

پانی پانی پانی پانی !
گلیاں کوچے کھیت اور کھائی

آہا آہا برکھا آئی

پانی آیا جھم جھم جھم جھم !
کالے جھنڈے نیلے پرچم

پریاں اتریں چھم چھم چھم چھم
چھم چھم بولی بالم بالم

پانی کا اشا بھر گرائی

اُڑتے مڑتے بوجھل گالے
اودے اودے کالے کالے

ہا ہا کرتے ندی نالے
تڑ تڑ تڑ تڑ سب پرنالے

سن سن سن سن سی پروائی

بیچ میں چھوٹے بن لہرائے
پربت بولے پنچھی گائے

مچلے بادل ناچے سائے　　راتیں ڈوبیں دن کجلائے
نالے بھر کے ندی گائی

کریں لچکیں شوخی دمکی　　مدرا چھلکی بوتل جھنکی
طبلہ ٹھنکا چھاتی کمکی　　ادہو ادہو بجلی چمکی
جیسے جنگل کی انگڑائی

دل میں کچھ لی ٹے کی کوئل　　ندی نالے سارے جل تھل
گھوڑے جیسے جھل جھل　　تان اڑاتی جنگل جنگل
کالے بھونرے کی بھنوائی

پھر نے نکلی گھر سے چھوری　　گال اچھوتے باہیں گوری
آنکھیں مٹکتیں چوسی چوری　　آگے آگے الھڑ گوری
پیچھے پیچھے چاتر دائی

بیٹھا کیوں ہے سر کھجلاتا !　　اٹھ اور سر پہ لیکر چھاتا
تان اڑاتا بین بجاتا　　ہنستا گاتا شور مچاتا
مدرا پیئے چل رے بھائی

سینہ ابھارے ندی ندی　　باندھ کھوے بنجی بنجی
دور تلک ہے پانی پانی　　در در آئی جمنا دیوی
گھر گھر پہنچی گنگا مائی

پانی مرتا دیواروں میں　　گھٹنوں گھٹنوں بازاروں میں
گرتا چکراتا غاروں میں　　اور منہ کے اڑتے تاروں میں
لیتا ڈگی پاتا پائی

جوبن ابھرا ہر جیون میں　　ساون گونجا سب کے تن میں

رادھا ناچیں الھڑ پن میں !　　مدرا چھلکی گوکل بن میں !!
شیام نے کیسی بین بجائی

طبلہ سارنگی اکتارا　　نوبت بین نقارا !
ڈھولک ڈفلی جھانجھ مجیرا　　کوئل دادر مور پپیہا
دائرہ پر طبلہ نے شہنائی

سن کر اپنے پی کی آون　　بولی بدھی لادے مادو
مہندی پیسی نن نن نن نن　　چوڑیاں بولیں کھن کھن
اسنی کا نپی لوگڑ مائی

سر کی لہریں کے دھالیے　　گوری دھری لاج کے مالیے
توڑا جیسے ٹوٹیں تارے　　سارے گاما گاما سارے
پائل جھنکی مستی چھائی

مدرا پی کر گاتا گایا　　من میں کالا بادل چھایا
ہلکا ہلکا مرجھایا　　سایہ دیپک دیپک آیا
تالو دھمکا دھن چکرائی

جلدی سکھیو لاؤ جھومر　　ہلکی چھاگل بھاری چادر
دوڑو آیا پانی سر پر　　لے دیکھو وہ ڈولی تیر
بیت نگر سے آیا نائی

اچھلیں من میں لے کی ڈھالیں　　اڑی ترچھی آئیں بوچھاریں
ناچیں چھم چھم گوری ناریں　　تار بکالے اڑیں اڑیں
دھرتی بھیلی رت بولائی

شر شر پانی ہوں ہوں جھکڑ　　چھپر ٹپ ٹپ نالے دھڑ دھڑ
بدلی گھم گھم بجلی کڑ کڑ　　چھم چھم تڑ دڑ تڑ دڑ
دھرتی بولی رام دھائی

ہجو

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ناسخ نے ہجو کی جڑ کاٹ دی اور ان کے تمام مصنفین نے اپنی کتابوں میں یہی لکھا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔

مولانا آزاد سے یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی نظر میں ضاحک و سودا کی ہجویں تھیں جن میں بھڑوے اور دھی کے ... تک موجود ہے۔

اسی طرح کی مصحفی و انشا کی ہجویں ہیں لکھنؤ کی تہذیب اس کو برداشت نہیں کر سکتی وہاں کی ہجو میں شاعرانہ لطافت کے ساتھ تہذیب و شائستگی ہے۔

لکھنؤ میں ہجو میر ضمیر سے شروع ہوئی وہ نویں ربیع الاوّل عمر و سودا کی ہجو پڑھتے اور اس کا نام انھوں نے ہرشیہ رکھا۔

افسوس ہے کہ وہ ہجویں مجھے نہیں ملیں۔

ناسخ و آتش کے زمانہ میں بھی ہجو کہی گئی امام بخش ناسخ نے اپنے نام کی مناسبت ایک غزل میں یہ مقطع کہا ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں!

شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں!!

آتش نے وہیں اس کا جواب کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں!
ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں!

ناسخ کے شاگرد و خواجہ وزیر نے اس کے جواب میں کہا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

یہ ایک سلسلہ ہے جو اب تک چلا آرہا ہے ہمارے زمانہ میں خوب خوب ہجو بن گئیں ان کا لطف زیادہ ہو جاتا اگر ان اشخاص کے نام لکھ دیئے جاتے جن کی ہجو کی گئی مگر یہ بات بہت سے افراد کو ناگوار ہوتی اس لیے بغیر کسی کا نام بتائے ہوئے ہجو سنیئے اور خود ان اشخاص پر منطبق کیجئے یہ نظمیں شیعہ کانفرنس سے ارکان سے متعلق ہیں۔

مقبول حسین ظریف

دفتر قومی پریشاں ہو تو اسکی قدر کیا — ہے جو فاضل البین نتھی افراد قوم
اس جگہ ہر مداوا جمع ہیں قومی طبیب — جو فقط لیمو لگا کر ہیں کھجاتے داد قوم
قوم کا بہروپیا بھی ہے نمائش گاہ میں — پارٹ اس کا ہے بتفریح دل ناشاد قوم
سر پہ دستار فضیلت پا میں ڈاسن کا بوٹ — نیچے جنٹلمین اوپر صورت زاہد قوم

دین کا دلال آدھا اہلِ دنیا کا ایجنٹ — مولوی بھی ماسٹر بھی واہ اے استادِ قوم
کعبہ کالج کی جانب توڑ کر اپنی نکیل — بلبلاتا آ رہا ہے اشترِ بغدادِ قوم
ایک قومی تیندوا بھی اس کے گھر سے ہیں تیغ — جس کا رمنہ ترائی مربع آبادِ قوم
قومی اک بھالو علی بابا جسے کہتے ہیں لوگ — وہ گرو چالیس قزاقوں کا اور استادِ قوم
قومی اک بندر بھی اس نے تب پالا ہے گھر میں — جو کہ ناداں دوست ہے کہتا ہے گر اللہ قوم
ہے اسی جلسہ میں قومی ایک خرگوشِ سفید — گھونس بن کر کھودتا رہتا ہے جو بنیادِ قوم

ابنائے وطن

سپوتو! مادرِ ہندوستان کے واہ کیا کہنا
نہ وضع خاندانی ہے نہ مذہب ہے نہ ملت ہے
سیہ چہرے پہ ہلٹ یا کہ گوہر پر گگرمُتّا
فقط اغیار کی تقلید میں اب تو یہ صورت ہے
تمازت سے سیاہی اور چہرے کی نہ بڑھ جائے
کہیں کالے نہ کہلائیں فقط اس کی حفاظت ہے
یہاں تک رفتہ رفتہ بڑھ گیا ہے خبط فیشن کا
نہ ڈاڑھی کی بزرگی ہے نہ کچھ مونچھوں کی عظمت ہے
جو اک ٹیکا لگائے مونچھ کا ہیں ناک کے نیچے
مریدِ حضرتِ ہیوٹ ہیں فیشن سے عقیدت ہے

البعیر

ناقۂ لیلیٰ کے بچے اے بعیرِ ذی وقار — قوم تیرے استبداد کی دم پر نثار
تیرے چہرے سے نمایاں اک شرارت کی شبیہ — خود بنائی جبر کا شکوہ سرکشی جس کا شعار
تیری آنکھیں بحرِ عیاری کے گویا دو حباب — کان جن میں کلمۂ حق کی صدائیں ناگوار
جیسا ہے ذی زیادہ تیرے تو بغض کی گرفت — پنجۂ دستِ قضا کے مثل وقتِ گیر و دار
[illegible] تیرے پنجۂ موذی سے بڑھ کر ستمگر — ناک میں تیری نکیل ہے کو شریعت کی مہار
گیا دوستی جھاڑتا ہے مظلوموں کو لاد کر — فطرتاً سرکش ہے تو لیکن بظاہر بردبار
اپنی گرمی پیٹھ پر لادے ہوئے قومی حقوق — کتنے اطمینان سے چلتا ہے تو مستانہ وار
زینتِ گردن تری کل قوم کی لعنت کا طوق — اس سے ظاہر ہے کہ تو نے کھو دیا سب اعتبار
دیکھنے میں کس قدر سیدھا ہے تو اے زرداد — کج روی سیکھا ہے تجھ سے اہلِ لیل و نہار
قوم کو باہم لڑانے میں تیری ذات فرد — میرے قومی اونٹ اے جنگِ جمل کی یادگار
بیٹھ تیرا قوم کی گاڑھی کمائی کے لئے — وقف ہے کھا کر نہیں لیتا کبھی تو اک ڈکار
تو جو امروہہ کا کانٹا بے تکلف چر گیا — قعرِ معدہ میں چھپا تیرے وہی انجامِ کار
بلبلاتا ہے شترخانے میں بیٹھا کیا تھا — گرد تیرے جمع بیسوں ساربانِ غمگسار
کوئی آیا ہے سہارنپور سے لیکر دوا — تیل رینڈی کا پلانے منہ کے اندر [illegible]
اور کوئی خاکِ شفا تجھ کو چٹانے کے لئے — چپکے چپکے پڑھ رہا ہے کچھ دعائیں [illegible]
کوئی حاجی نیم کی ٹہنی ہلا کر دور سے — کہہ رہا ہے اٹھ بھی جا [illegible] ذکر اے بد شعار
اور کوئی کھینچا ہے آیا ہے گھبرایا ہوا — مال و زر اپنا [illegible] کرنے نثار
کوئی کہتا ہے کہ اس کو [illegible] — عید قرباں کو [illegible] آباد میں بیچا کرے